جامعہ مدنیہ لاہور کا ترجمان

علمی دینی اور اصلاحی مجلہ

انوارِ مدینہ

لاہور

بیاد

عالمِ ربانی محدثِ کبیر حضرۃ مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ

بانی جامعہ مدنیہ

نگران

مولانا سید رشید میاں مدظلہ

مہتمم جامعہ مدنیہ، لاہور

ربیع الاول

سنہ ۱۴۱۷ھ

اگست

سنہ ۱۹۹۶ء

بہترین چیز

احنف بن قیسؒ نے فرمایا ہے کہ بہترین چیز جو کسی بندے کو دی جاتی ہے۔

① وہ عقلِ دُور اندیش ہے۔ یہ نہ ہو تو پھر

② بہترین ادب و اخلاق کا سرمایہ ہے۔ یہ بھی نہ ہو تو

③ رفیقِ ہم نوا و دمساز ہے، یہ بھی نہ ہو تو پھر

④ یادِ الٰہی میں ہمیشہ لگا رہنے والا دلِ یکسو ہے، اس سے بھی محرومی ہو تو

⑤ سکوتِ مسلسل اور خموشیٔ پیہم ہے اور اگر بد قسمتی سے کسی کو مندرجہ بالا فضائل میں سے کوئی فضیلت حتّٰی کہ برسبیلِ تنزّل چپ رہ کر اپنے عیوب کی پردہ پوشی کی بھی عادت نہ ہو تو ایسے بدنصیب کا زندہ رہنے سے مرجانا ہی افضل و اولیٰ ہے۔

(المنبہات علی الاستعداد لیوم المعاد مترجم ص: ۱۶۴)

قسط : ۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

سیّد محمود میاں

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم ۔ امابعد!

زیرِ نظر اداریہ نظامِ تعلیم سے متعلّق گزشتہ اداریہ کا تسلسل ہے جس میں پنجاب اسمبلی کے اسپیکر جناب حنیف رامے کے بیان پر تبصرہ کیا گیا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا۔ "انگریز نے برِصغیر میں ظلم کے ساتھ یہ مہربانی کی کہ تعلیمی اداروں میں طریقہ تعلیم انگریزی تھا انگریزی چھوڑی تو ہمیں دُنیا سے دیس نکالا مل جائے گا۔"

اب ہم موجودہ نظامِ تعلیم کی فرسودگی کا جائزہ "تاریخ کے اوراق سے پیش کرتے ہیں تا کہ قارئین پر موجودہ انگریزی نظامِ تعلیم کی نحوست کے ساتھ ساتھ اس کے پس پردہ انگریز کے ناپاک عزائم بھی واضح ہو جائیں۔

میں اپنے جدِ امجد حضرت مولانا سیّد محمّد میاں صاحب نور اللہ مرقدہ کی تالیف "ہندوستان شاہانِ مغلیہ کے عہد میں" اور "علماءِ حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے" سے چند اقتباسات بطور تاریخی حوالہ پیش کرتا ہوں۔

حضرت موصوف رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں

"مختصر یہ کہ جب انگریز کا نظریہ ابتداء ہی سے یہ تھا کہ ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ یورپ کے لیے حاصل کریں تو قدرتی طور پر ہندوستان کا مفاد اس کے مفاد کے

مخالف تھا اُس کا فائدہ صرف اسی صُورت میں تھا کہ ہندوستان بے کس و بے حس مزدُور کی حیثیّت سے روپیہ کماتا رہے اور یورپ کے حوالہ کرتا رہے اس مقصد کو پُورا کرنے کے لیے لامحالہ انگریز کو صرف وہی صورتیں سوچنی اور عمل میں لانی تھیں جن سے

(الف) احساسِ وطنیت ختم ہوجائے۔

(ب) جن باحمیت حریّت پسند جماعتوں یا افراد کا عام ہندوستانیوں پر اقتدار ہے اُس کو اُٹھایا جائے۔

(ج) جبکہ مذہبی جماعتوں کو عوام پر اقتدار تھا تو ضروری ہُوا کہ یا تو عوام کو اپنا ہم مذہب کیا جائے ورنہ کم از کم ان کو اپنے مذہب سے متنفر کر دیا جائے۔

(د) ہندوستانیوں کے دلوں میں ایسے جذبات پیدا کیے جائیں جن کی بناء پر وہ بھوکے اور قلاش ہوکر بھی انگریز کے وفادار ہیں۔

(ھ) ہندوستانیوں کو ایک دوسرے سے اتنا خائف کر دیا جائے کہ وہ انگریز کے وجود ہی کو اپنی سلامتی تصوّر کریں۔ آؤ ـــــ ان سیاہ فام ہندوستانیوں کی تعلیم کو ختم کر دو۔ ان کے فکر و تدبیر کے سرچشموں کو خشک کر دو ـــــ تاکہ یہ بہتر مزدُور ثابت ہوں اور اَبدُ الاباد کے لیے ان کی قسمت پر غلامی کی مہر لگ جائے۔

یہ تھا پہلا نظریہ خود غرض کمینہ طبیعت گورے ساہوکاروں کا جو تجارت کے ساتھ قزاقی بھی کر رہے تھے، لیکن کیا یہ جاہل انگریز کے وفادار ہوں گے اور کیا ان کے دِلوں سے اپنے مذہب اور مذہبی پیشواؤں کا اقتدار بھی اُٹھ جائے گا۔ اس کی صُورت صرف یہ ہے کہ ان کو کرسچن بنا لیا جائے۔

یہ تھا دوسرا نظریہ ان ملّت فروش سیاسی ڈاکوؤں کا جنھوں نے مذہب کو سیاست کا آلہ کار بنایا اور اس کی تعلیم دی۔

مگر کیا انگریزی حکومت کی مشنری کو کچھ تعلیم یافتہ غلاموں کی ضرورت نہ ہوگی؟ اور کیا دفتروں کے کلرک لندن سے ہی بلائے جائیں گے؟ یہ تیسرا سوال تھا جس کے حل کے لیے برطانوی ڈپلومیسی کے ماہرین نے ہندوستانیوں کی تعلیم کی طرف توجّہ کی اور ایسے طرزِ تعلیم پر غور ہونے لگا جو اُن کے اغراض اور ان کے منشاء کے مطابق ہندوستانی نوجوانوں کے دماغوں کی تخلیق کرے۔ یہ ہے مختصر ایجنڈا

ان غور طلب مسائل کا جن کے حل کے لیے ہندوستانی مفادات کے غاصب برطانوی سامراج کے کٹر وفاداروں کے دماغ عرصہ تک اُلجھے رہے اس ایجنڈے کے پیش نظر ہماری آئندہ بحث کے موضوع یہ تین امر قرار پاتے ہیں۔

(۱) ہندوستانیوں کو جاہل بنانا (۲) عیسائی بنانا (۳) لامذہب بنانا۔

(علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے ص ۱۵/۱ ج)

ذرا آگے چل کر "ہندوستانیوں کو جاہل بنانے" کے عنوان کے ذیل میں حضرت رحمۃ اللہ تحریر فرماتے ہیں۔

"اس کمینہ اور خود غرض حکومت (جو ایک ہی وقت میں سوداگر بھی تھی اور حاکم بھی) کی خود غرضی اور تعلیم سے قطعاً بے نیازی کا اثر یہ پڑا کہ جیسے جیسے کمپنی کی حکومت بڑھتی رہی علم و فضل کے بجائے جہالت پھیلتی رہی، چنانچہ ۱۸۲۳ء میں آنریبل۔ایم الفنسٹن اور آنریبل۔ ایف وارڈن نے ایک متفقہ یادداشت گورنمنٹ میں پیش کی جس کا اقتباس یہ ہے۔

"انصاف یہ ہے کہ ہم نے دیسیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیے ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف علمی ترقی کے تمام ذرائع مٹا دیے بلکہ قوم کے اصلی علوم بھی گم ہو جانے اور پہلے لوگوں کی ذہانت کی پیداوار فراموش ہو جانے کا اندیشہ ہے اس الزام کو دُور کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔" (ایضاً ص ۲۱)

○

"ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کی کوشش" کے زیرِ عنوان حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں۔ وہی آنریبل مسٹر الفنسٹن اور آنریبل ایف وارڈن اپنی اسی یادداشت میں جس میں وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس الزام کے رفع کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ تحریر فرماتے ہیں۔

"میں اعلانیہ نہیں تو در پردہ پادریوں کی حوصلہ افزائی کروں گا اگرچہ مجھے گورنر صاحب سے اس بارہ میں اتفاق ہے کہ مذہبی[1] اُمور میں امداد کرنے سے احتراز کیا جائے تاہم جب تک ہندوستانی لوگ عیسائیوں کی شکایت[2] نہ کریں تب تک اُن[3] کی تعلیم کے مفید ہونے میں ذرا

---

[1] مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت سے احتراز کیا جائے۔ [2] یعنی عیسائیت کی تبلیغ کے خلاف احتجاج نہ کریں

[3] پادریوں کی تبلیغ۔

شُبہ نہیں اگر تعلیم سے ان کی راویں میں ایسی تبدیلی پیدا نہ ہو سکے کہ وہ اپنے مذہب کو لغو سمجھنے لگیں تاہم وہ اس سے زیادہ ایمان دار اور محنتی رعایا تو ضرور بن جائیں گے"۔ (ایضاً ص ۲۲ ج ۱)

مصنّف علماء حق آگے چل کر ممبر پارلیمنٹ مسٹر نیگلس کی تقریر سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جو اُسی نے ۱۸۵۷ء کے آغاز میں پارلیمنٹ کے دارالعلوم میں کی تھی...

"خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیرِ نگیں ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے ہر شخص کو اپنی تمام تر قوّت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کی عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیے اور اس میں کسی طرح تساہل نہ کرنا چاہیے"۔ (ایضا ص ۲۶ ج ۱)

ہندوستان پہ عیسائیت کی یلغار کے مقابل سینہ سپر ہونے والے علماء ملّت کی خدمات کے تحت مصنّف رح تحریر فرماتے ہیں۔

"رد عیسائیت بظاہر ایک واعظانہ اور مناظرانہ چیز ہے جس کو سیاست سے بظاہر کوئی تعلّق نہیں، لیکن غور کرو جب حکومت عیسائی گر ہو جس کا نقطۂ نظر ہی یہ ہو کہ سارا ہندوستان عیسائی مذہب اختیار کرے اور اس کی تمنّا دلوں کے پردوں سے نکل کر زبانوں تک آرہی ہو اور بے امین اور جابر حکومت کا فولادی پنجہ اس کی امداد کر رہا ہو تو یہی تبلیغی اور خالص مذہبی خدمت کس قدر سیاسی اور کتنی زیادہ سخت اور صبر آزما بن جاتی ہے... بلا شُبہ رد عیسائیت کے سلسلہ میں ہر ایک مناظرہ ہر ایک تبلیغ ہر ایک تصنیف اغراض حکومت سے سراسر بغاوت تھی۔ انتہا یہ کہ ۵۷ء کے بعد بھی علماء کرام کی ایک جماعت کو اس پر عبور دریائے شور کر دیا گیا کہ وہ انگریزوں کو نصاریٰ اور نصرانی کہتے تھے اسوقت اس گمراہ کُن تحریک کے مقابلہ پہ کون سینہ سپر ہُوا کس نے ہتھیلی پر سر رکھ کر عیسائیوں کا مقابلہ کیا، کس نے پادریوں کا تعاقب کیا مناظروں سے اُن کو لاجواب کیا انکی تردید میں کتابیں لکھیں۔ یہی علماء ملّت تھے جن کو انگریز اور انگریزی ایجنٹوں نے گالیاں سُنائیں اور سُناتے رہے جن کو تنگ نظر جاہل مذہبی مجنون اور پاگل کہا گیا اور بدنام کیا گیا کس قدر ستم ہے کہ وہ دجال پادری جو لُوٹ کے روپیوں سے لاکھ روپیہ سالانہ کی تنخواہ

پاکر ہندوستانیوں کی دین و دُنیا خراب کریں نہ صرف اُن کی گردنوں کو بلکہ ان کے دلوں کو گورنمنٹ برطانیہ کی چوکھٹ پہ جُھکائیں اور ظاہر و باطن عمل و عقیدہ ہر ایک لحاظ سے ابدالاباد کے لیے ان کو غلام بنادے وہ تو مقدس خادمان خلق پاکباز مجاہد اور وہ عُلماء جو اُن کے دامِ فریب میں آنے سے انکار کر دیں اور اپنے بھائیوں کو ان کے مکر سے آگاہ کر دیں وہ مجنوں پاگل تنگ نظر جاہل۔

"بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست"

اس سے بڑھ کر ستم اور ظلم ہے ان خود غرض ہندوستانیوں[1] کا جو آج تک علماء کو مطعون کرتے ہیں کہ اُنھوں نے مُسلمانوں کو انگریزی سے روک کر سیاست میں ہنروں سے پیچھے کر دیا بلاشبہ عُلماء اُمّت نے انگریزی اسکولوں سے بائیکاٹ کا حکم دیا اور نہایت دلیری خودداری اور پامردی سے انگریزی کی منحوس اغراض کو فیل کیا، لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتے تو کیا آج اعتراض کرنے والے اصحاب کسی مُسلمان گھرانے کے فرزند ہو سکتے تھے۔ مس منٹو کا ارشاد ہے "عیسائی مبلغوں کے طرزِ عمل سے مسلمان انگریزی تعلیم کو مذہب عیسوی کی تعلیم کے مرادف سمجھتے تھے اور بمقابلہ ہندوؤں کے وہ اپنے بچّوں کو پادریوں کے زیرِ اثر رکھنے پر راضی نہ تھے۔ ان کے غرور اور اُن کی مذہبی خودداری کو اس سے اشتعال ہوتا تھا اس لیے وہ اس تحریک سے علیحدہ رہے"۔

کیا اس سے زیادہ کوئی ظلم ہو سکتا ہے کہ مس منٹو جیسی متعصبہ تو اس بائیکاٹ کو خودداری اور قومی غرور سے تعبیر کرے اور ہمارے خود رَو لیڈر اس کو غداری اور عُلماء کی کوتاہ اندیشی قرار دیں افسوس

چشم خود بیں کہ برکندہ باد عیب نماند ہنرش در نظر

(ایضاً ص۲۷)

(جاری ہے)

---

[1] اس کتاب کا حصّہ اوّل تقسیم سے پیشتر ۱۹۳۹ء میں تالیف کیا گیا۔ اس لیے ہندوستانیوں کا لفظ استعمال کیا گیا، ورنہ تو یہ خود غرضی ہندوستانیوں اور پاکستانیوں سب میں قدرِ مشترک ہے۔ محمود میاں غفرلہ

مولای صلّ وسلّم دائماً ابداً
علیٰ حبیبک خیر الخلق کلّھم

درسِ حدیث

استاذ العلماء شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ کے زیرِ اہتمام ہر اتوار کو نمازِ مغرب کے بعد جامعہ مدنیہ میں "مجلسِ ذکر" منعقد ہوتی تھی۔ ذکر سے فارغ ہو کر حضرت رحمہ اللہ حدیث شریف کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ ذکر و بیان کی یہ مبارک اور رُوح پرور محفل کس قدر جاذب و پُرکشش ہوتی تھی الفاظ اس کی تعبیر سے قاصر ہیں۔

محترم الحاج محمود احمد عارف رح کی خواہش و فرمائش پر عزیز بھائی شاہد صاحب سلمہ، نے حضرت شیخ الحدیث قدس سرہٗ کے بہت سے دروس ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ محفوظ کر لیے تھے اور پھر دروس والی تمام کیسٹیں اُنہوں نے مولانا سیّد محمود میاں صاحب کو عطا کر دیں۔

ہماری دُعا ہے کہ جن کی مہربانی، توجّہ اور سعی سے یہ انمول علمی جواہر ریزے ہمارے ہاتھ لگے، حق تعالیٰ اُن سب کو بیش از بیش اَجر سے نوازے۔ ہم انشاء اللہ تعالیٰ یہ قیمتی لؤلؤ لالہ "انوارِ مدینہ" کے ذریعہ حضرت رحمہ اللہ کے مریدین و احباب تک قسط وار پہنچاتے رہیں گے۔

واضح رہے کہ حضرت کے خلفِ اکبر اور جانشین حضرت مولانا سیّد رشید میاں صاحب کے زیرِ اہتمام ذکر و درس کا یہ سلسلہ بفضلہ تعالیٰ اَب بھی جاری ہے۔

ہنوز آں ابرِ رحمت در فشان است
خم و خمخانہ با مہر و نشان است

کیسٹ نمبر ۹ سائیڈ اے ۳۰ ؍ اپریل ۱۹۸۲ء

الحمد للہ ربّ العٰلمین والصّلوٰۃ والسّلام علیٰ خیر خلقہ سیّدنا و مولانا محمّدٍ وّ اٰلہٖ واصحابہٖ اجمعین

امابعد! عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ سَاَلْتُ رَبِّیْ عَنِ اخْتِلَافِ اَصْحَابِیْ مِنْ بَعْدِیْ فَاَوْحٰی اِلَیَّ یَا مُحَمَّدُ اِنَّ اَصْحَابَکَ عِنْدِیْ بِمَنْزِلَۃِ النُّجُوْمِ فِی السَّمَآءِ بَعْضُھَا اَقْوٰی مِنْ بَعْضٍ وَّ لِکُلٍّ نُوْرٌ فَمَنْ اَخَذَ بِشَیْءٍ مِّمَّا ھُمْ عَلَیْہِ مِنَ اخْتِلَافِھِمْ فَھُوَ عِنْدِیْ عَلٰی ھُدًی قَالَ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ فَبِاَیِّھِمُ اقْتَدَیْتُمُ اھْتَدَیْتُمْ۔[1]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو فرماتے ہوئے سُنا کہ مَیں نے اپنے پروردگار سے اپنے صحابہ کے درمیان اختلاف کے بارے میں پُوچھا (جو شریعت کے فروعی مسائل ہیں)، میرے بعد واقع ہوگا، تو اللہ تعالیٰ

---

[1] مشکوٰۃ ص ۵۵۴

نے وحی کے ذریعے مجھے آگاہ فرمایا کہ اے محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) حقیقت یہ ہے کہ تمہارے صحابہ میرے نزدیک ایسے ہیں جیسے آسمان پر ستارے (جس طرح) ان ستاروں میں سے اگرچہ بعض زیادہ قوی یعنی زیادہ روشن ہیں لیکن نور (روشنی) ان میں سے ہر ایک میں ہے (اسی طرح صحابہ میں سے ہر ایک اپنے اپنے مرتبہ اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق نورِ ہدایت رکھتا ہے) پس جس شخص نے (علمی و فقہی مسائل میں) ان کے اختلاف میں سے جس چیز کو بھی اختیار کر لیا میرے نزدیک وہ ہدایت پر ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے تم جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے جنابِ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا ہے ارشاد فرمایا سَاَلْتُ رَبِّیْ عَنِ اخْتِلَافِ اَصْحَابِیْ مِنْ بَعْدِیْ میں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ میرے بعد آنے والوں میں اختلاف ہوگا، فَاَوْحٰی اِلَیَّ یَا مُحَمَّدُ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر جواب میں وحی فرمائی کہ اے محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اِنَّ اَصْحَابَکَ عِنْدِیْ بِمَنْزِلَةِ النُّجُوْمِ فِی السَّمَاءِ آپ کے جو صحابہ ہیں یہ میرے نزدیک ایسے ہیں جیسے آسمان میں ستارے "بَعْضُھَا اَقْوٰی مِنْ بَعْضٍ" کسی ستارے کی روشنی کم ہے کسی کی زیادہ ہے کسی کی اور زیادہ ہے۔ وَ لِکُلٍّ نُوْرٌ لیکن روشنی سب میں ہے اسی طریقہ پر یہ صحابہ جنہیں میں نے تمہارے ساتھ کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کا حال بھی ایسے ہی ہے کہ ان میں نُور ہے، ان میں ہدایت ہے، ایمان ہے، بہت قوّت ہے ایمان کی اب جب ان سب میں نُور ہوگا فَمَنْ اَخَذَ بِشَیْءٍ مِّمَّا ھُمْ عَلَیْہِ مِنَ اخْتِلَافِھِمْ۔

تو اگر ان میں آپ کے بعد اختلاف بھی ہوا تو ان کے بعد آنے والے لوگوں میں سے جس صحابی کا بھی کوئی پیروی کر لے گا اور (ان کی راہ) لے لے گا۔

فَھُوَ عِنْدِیْ عَلٰی ھُدًی وہ میرے نزدیک ہدایت پر ہوگا، جو بھی صحابہ کرام کی پیروی کرے گا، وہ ہدایت پر ہوگا، صحابی چھوٹے ہوں صحابی بڑے ہوں سب ہدایت پر ہیں، قَالَ وَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اور جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد

فرمایا اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْم۔

میرے صحابہ ایسے ہیں جیسے ستارے فَبِاَیِّھِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ۔ ان میں سے جس کی بھی پیروی کرلو گے ہدایت پاجاؤ گے۔

تو اب دُنیا میں صحابۂ کرام کے بعد جو لوگ آئے۔ یعنی تابعین وہ فتوے دیتے رہے۔

تابعین میں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ صغار تابعین میں ہیں۔ یعنی چھوٹے درجے کے تابعین میں کیونکہ ان کا علم جو ہے۔ وہ صحابہ سے نہیں ہے اُنھوں نے جو علم حاصل کیا ہے وہ صحابہ کے شاگردوں سے حاصل کیا ہے۔ ہاں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ تقریباً دس سے زیادہ صحابۂ کرام ہیں جن کو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے پایا ہے۔

تیئیس کے قریب روایتیں بنتی ہیں جو صحابۂ کرام سے بنتی ہیں اور سترہ کے قریب صحابہ کرام کے اسماء گرامی ہیں کہ جن کا زمانہ پایا ہے اور بظاہر یہ ہے کہ دیکھا بھی ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سب سے آخر میں وفات ہوئی ہے ان کی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کو تو متعدّد بار دیکھا ہے امام اعظم رحمہ اللہ نے لَمَّا قَدِمَ عَلَیْھِمُ الْکُوْفَۃَ جب وہ کوفے تشریف لے گئے تو وہاں زیارت سے مشرف ہوئے ہیں اور روایت بھی ملتی ہے کہ میں نے حضرت انس کو دیکھا کہ نماز پڑھ رہے تھے، تو اب صحابہ کرام کے بعد تابعین ہیں۔

اب تابعین سے جو مسائل پوچھے گئے ہیں اور اُنھوں نے جو جوابات دیے ہیں وہ سب کے سب حدیث میں شمار ہوتے ہیں اور صحابۂ کرام کے بعد صغار تابعین میں آکر امام اعظمؒ کا درجہ ہے اور یہ سب سے بڑا درجہ ہے۔ کیونکہ امام مالکؒ امام اعظمؒ سے چھوٹے ہیں اُنھوں نے کسی صحابی کو نہیں دیکھا اور امام شافعیؒ امام مالکؒ کے شاگرد ہیں اُنھوں نے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو بھی نہیں دیکھا۔ ان کی وفات ہوچکی تھی جس سال امام اعظمؒ کی وفات ہوئی (ایک سو پچاس میں) اس سال امام شافعی پیدا ہوتے ہیں اور امام احمدؒ امام شافعیؒ سے بھی کچھ چھوٹے ہیں۔

یہ مسالک باقی رہ گئے دُنیا میں خُدا کی قدرت ہے اور کوئی وجہ سمجھ لیں آپ کیونکہ بڑے بڑے حضرات گزرے ہیں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں کئی سو علماء تھے ایسے جو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی طرح ــــ علمِ حدیث سے واقف تھے علمِ تفسیر سے واقف تھے لیکن چلا مسلک

سب سے زیادہ امام اعظمؒ ہی کا اور اس کی ایک وجہ سمجھ میں آتی بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حدیثیں جانتا بھی ہے تو عام آدمی کو اس سے فائدہ حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ کوئی ضرورت اسے پیش آئی اور اس نے مسئلہ پُوچھ لیا لوگ مسائل پُوچھتے تھے اور اس پر پھر حکم چلتا تھا فیصلے ہوتے تھے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے جو پُوچھا گیا۔ فیصلے اس پر چلتے رہے۔ بہت بڑی تعداد بن گئی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مسائل کی جو اُن سے پُوچھے گئے اور اُنھوں نے جواب دیے اور اُنھوں نے سوچنے کا طریقہ بھی سکھلایا کہ سوچنے کا طریقہ یہ ہے اس طرح سے سوچنا چاہیے یہ اُصول ہیں حدیث کے، یہ اُصول ہیں فقہ کے، اس طرح استنباط کریں، اس طرح سے سوچیں تو وہ (سیکھنے والے) بن گئے اُن کے شاگرد اور شاگرد نکلے بڑے لائق، اُنھوں نے وہ لکھیں چیزیں آگے چلائیں اور ایک شاگرد اُن کے بن گئے قاضی القضاۃ یعنی امام ابو یُوسف رحمۃ اللہ علیہ تو ان کی وجہ سے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک بہت ہی تقویت پکڑ گیا اور سب سے زیادہ سوالات کے جوابات امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے ہی لیے گئے، جہاں بھی جاتے تھے ہجوم ہو جاتا تھا۔

ایک بزرگ گزرے ہیں لیثؒ ان کا نام ہے، وہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ہم پلّہ ہیں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لیث امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے کم درجے کے نہیں تھے، لیکن ان کے جو شاگرد تھے وہ ایسے لائق نہیں تھے جیسے امام مالکؒ کے۔ امام مالکؒ کی حدیثیں لکھیں۔ اُن کے خیالات لکھے مسائل پُوچھے وہ لکھے اِن کے نہیں لکھے گئے ورنہ وہ درجے میں امام مالکؒ سے کم نہیں تھے تو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ حج کے لیے گئے ہُوئے تھے، حج الگ کرتے تھے عمرہ الگ کرتے تھے۔ سفر ہی میں بہت وقت گزارتے۔ خاصا وقت سفر میں گزارتے، لیکن تعلیمی کام سفر میں بھی جاری رہتا رہا ان بزرگوں کا، یہ پہنچے مکہ مکرّمہ میں لیثؒ کہتے ہیں کہ مَیں نے دیکھا ایک جگہ لوگ جمع ہیں، ہجوم ہے لوگوں کا مَیں نے پُوچھا یہ کون صاحب ہیں؟ اُنھوں نے بتایا یہ نعمان ہیں (ابو حنیفہؒ) کہ شاید کہ ممکن ہے اُنھوں نے نام سُن رکھا ہو۔ بہر حال وہ پاس پہنچے ایک آدمی نے ایک سوال کیا اُن سے کہ میں بڑا تنگ آیا ہوا ہوں اپنے بیٹے کے معاملے میں بیٹے کا قصّہ کیا ہے قصّہ یہ ہے کہ میں اس کی شادی کر دیتا ہوں جب شادی کرتا ہوں تو طلاق دے دیتا ہے، پھر دوسری جگہ کرتا ہوں پھر اس نے طلاق دے دی، پھر کہتے ہیں مَیں نے یہ کیا باندی خرید کر دے دی اُسے اُس نے اس کو آزاد

کر دیا۔ اور باندی خرید دی اس نے آزاد کر دیا، اس طرح میں بڑے نقصان میں ہوگیا۔ میرا روپیہ تلف ہو رہا ہے اس طرح شادی کرتا ہوں تو خرچہ، اور باندی خرید کر دیتا ہوں تو خرچہ، وہ نہ بیوی رکھتا ہے نہ باندی رکھتا ہے۔ اس کا حل بتلائیے؟ قانونی شرعی حل بتلائیے؟

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے جب اس نے یہ بات کی تو آپ نے فوراً جواب دیا کہ ایک باندی خرید لو تم اور اس کا نکاح کر دو بیٹے سے اگر بیٹا طلاق بھی دے گا تو باندی تمہاری ہوگی۔ مالی نقصان تمہیں کوئی نہیں ہوگا، امام لیث رح کہتے ہیں کہ مجھے امام اعظم رحمۃ اللہ کا جو جواب تھا وہ جواب بھی بہت اچھا تھا، مگر فوراً جو جواب دیا انھوں نے وہ مجھے جواب سے بھی زیادہ عجیب لگا اور اچھا لگا۔

ایک بزرگ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ ہیں منطقی فلسفی اور بہت زیادہ بحثیں کرنے والے بہت بڑے محقق ہیں۔ ہیں یہ شافعی المسلک انھوں نے ایک تفسیر لکھی ہے اور اس کا نام رکھا ہے "تفسیر کبیر" ہے بھی بہت بڑی طویل اور اس میں معتزلہ کا رد ہے، یہ جو پرویزی ہیں یہ اُن کی شاخ ہیں ان کا رد ہے اس میں۔

جہاں امام صاحب کا تذکرہ آتا ہے، وہ بڑی دلچسپی سے ذکر کرتے ہیں، کیونکہ اُن کے ذوق کے مطابق بنتی ہے وہ بات۔ اُنھوں نے سات آٹھ قصے نقل کیے ہیں۔ تفسیر کبیر میں امام اعظم رح کی نکتہ رسی کے، اس میں یہ بھی ہے کہ ایک شخص نے قسم کھالی بیوی سے کہ اگر میں تیرے سے پہلے بولوں تو تجھے طلاق، بولوں گا ہی نہیں تیرے سے اگر میں تیرے سے پہلے بولوں تو ایسے، بیوی بھی جلالی تھی، اس نے بھی قسم کھالی کہ اگر میں تم سے پہلے بولوں تو غلام آزاد ہو جائیں میرے تو اب وہ دونوں پھنس گئے نہ وہ پہلے بول سکتا ہے اور نہ وہ پہلے بول سکتی ہے۔ وہ پہلے بولے گا تو طلاق ہو جائے گی۔ بیوی بولے گی تو غلام آزاد ہو جائیں گے کئی جگہ مسئلہ پوچھا اس نے، ہر جگہ یہی جواب ملا کہ بہت مشکل ہے اب تو کوئی حل نہیں رہا اس کا۔ وہ امام اعظم رحمۃ اللہ کے پاس بھی آیا پوچھنے کہ ایسی شکل بنی ہے تو اس میں کیا کریں تو اُنھوں نے کہا کہ اب تم جا کے بول لو کچھ نہیں ہوگا، اُس نے جا کر بات کر لی، لوگوں میں چرچا ہوا کہ یہ تو اُنھوں نے غلط فتوای دے دیا۔ وہ بول بھی لیا اور طلاق بھی نہیں ہوئی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو پھر امام صاحب سے پوچھا امام صاحب کے پاس کئی لوگ آئے۔ آخر ہجوم کرتے ہوں گے اس زمانے میں قانون بھی یہی تھا ساری چیزیں یہیں

ہوتی تھیں اور لوگوں میں عمل بھی بہت تھا۔ بے عملی چل نہیں سکتی تھی تو وہ آئے، ان کو سمجھایا امام صاحب نے کہ دیکھو جب اس نے یہ کہا تھا کہ اگر میں تیرے سے بولوں پہلے تو یہ ہو جائے، اس کے بعد بیوی بولی، شوہر جب یہ کہہ چکا ہے تب بیوی بولی ہے نا؟ تو اب شوہر جا کے بول لے اب پہلے بولنے والا تو نہیں رہا۔ یعنی اس نے کہا نا بیوی سے کہ اگر میں بولوں تیرے سے پہلے تو یہ ہوگا، بیوی کے بارے میں طلاق کا کہا اس نے فوراً بیوی بول پڑی غصّے میں کہ میرے بھی غلام آزاد تو اب جو شوہر بولے گا تو پہلے بولنے والا نہیں رہا تو لوگوں کا کہا بالکل ٹھیک کہا ہے، مطلب یہ ہے کہ اتنی گہرائی تک ذہن نہیں پہنچتے تھے۔ لوگوں کے اس وجہ سے ایسے ہو جاتا تھا کہ اُن کے بارے میں اعتراض کرتے تھے لوگ، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی سمجھ بہت زیادہ تھی تو مثالیں ان کی یہ قصّے بہت ہیں۔ بہت زیادہ اسی طرح فقہ کے اندر بھی ملتی ہے گہرائی فقہ اسی کا نام ہے دین کی صحیح سمجھ اور گہرائی اس کا نام فقہ ہے۔

تو آقا، نامدار صلّی اللہ علیہ وسلّم نے صحابہ کرام کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ بمنزلہ نجوم کے ہیں ستاروں کی طرح ہیں تو اُن میں سے کسی کی بھی پیروی کرلو نجات پا جاؤ گے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ امام اعظم رح جیسے تو بہت لوگ تھے اس وقت میں نے اندازہ کیا ہے کہ کم از کم ڈیڑھ سو آدمی تھے ایسے جیسے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ۔ کم از کم اتنے آدمی تھے۔ اسی پائے کے بڑے بڑے لوگ، لیکن مسلک چلا ان کا ـــــ مسلک چلنے کی وجہ میں نے آپ کو بتلائی تھی کہ یہ ہو گئی۔

اب امام اعظم رح کا مسلک چلا پھر امام مالک رح کا چلا، امام مالک رح کے دَور میں ان جیسے بہت تھے مگر چلا اُن کا، یہ خدا کی طرف سے ہے امام شافعی رح کے دَور میں بھی بہت تھے چلا اُن کا ہے یہ خدا کی طرف سے ہے، تو یہ حارہ رہ گئے مسلک، ان سب میں یہی ہے کہ صحابۂ کرام کو دیکھتے تھے، صحابۂ کرام نے کیا کیا کسی نے کسی صحابی کا عمل اور روایت لے لی اور کسی نے کسی صحابی کا عمل اور روایت لے لی۔ اور سب کے سب اہلِ سُنّت کہلاتے ہیں اور سب کے سب متبعینِ سُنّت شمار ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں بھی پڑھتے ہیں جس زمانے میں ترکی دَور تھا۔ اس زمانے میں شافعی امام بھی ہوتے تھے حنفی بھی ہوتے تھے۔ حرم محترم کی اُنھوں نے بڑی خدمتیں کی ہیں۔ ائمہ بھی رکھے ہیں چاروں مسالک کے، لیکن حنفی زیادہ تھے اس واسطے کہ ترکی حکومت خود حنفیوں کی

تھی۔ اب حنبلی زیادہ ہیں کیونکہ حکومت حنبلیوں کی ہے بلکہ زیادہ کیا کل کے کل حنبلی ہیں، دوسرا امام نہیں ہے۔ دوسرے امام کے پیروکار وہاں نہیں ہیں۔ سرکاری امام وہی ہیں تو جس کی حکومت ہوتی ہے اس مسلک کے لوگ ہوتے ہیں، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں ترکی دور میں سب حنفی مسلک کے لوگ تھے تو یہ جو اچھا سلسلہ چل پڑا ان چاروں مسالک میں کہ دوسرے جتنے رہنے والے تھے سارے ان کے پیچھے نماز پڑھتے، مدینہ شریف میں شافعی بھی ہیں مالکی بھی ہیں حنبلی بھی ہیں۔ حنفی بھی ہیں مکہ مکرمہ میں بھی یہی ہے مگر دوسرے سب پڑھتے ہیں اور کوئی اعتراض نہیں کرتا کوئی حقارت سے نہیں دیکھتا وہ سب کے سب چونکہ ایک امام کے پیروکار ہیں انھوں نے اعلان یہ کر رکھا ہے کہ ہم امام کے پیروکار ہیں اب ان سے چاہے ہٹے ہوئے بھی ہوں بہر حال اعلان سب کا یہی ہے اور اصولاً وہ نام بھی ان کا لیتے ہیں۔ تو یہ سب کے سب اہلِ سنّت شمار ہوتے ہیں۔ حنبلی ہوں، حنفی ہوں، شافعی ہوں، مالکی ہوں یہ چار جو چلے مسلک بس یہ خدا کی طرف سے ہے۔

باقی رہا یہ کہ علماء یہی تھے صرف چار، یہ بات نہیں ہے۔ ہر دور میں سینکڑوں رہے ہیں۔ انہی جیسے انہی کے پائے کے مگر چلنا اللہ کی قدرت تھی کہ یہی چل سکے، ان سب کا مدار صحابہ کرام تھے۔ جو مسئلہ پیش آئے گا، اس میں آپ پوچھیں گے کہ کیا دلیل ہے تو وہ صحابہ کا عمل پیش کریں گے اس میں، یا حدیث پیش کریں گے کہ صحابی نے فلاں روایت کی تو جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا وہ درست ہے۔

دوسری حدیث صحیح میں ارشاد ہے کہ صحابہ کرام سے آپ نے فرمایا کہ میری اُمّت میں فرقے پیدا ہو جائیں گے اور فرمایا کُلُّھُمْ فِی النَّارِ اِلَّا مِلَّۃً وَاحِدَۃً سب کے سب جہنّم میں جائیں گے سوائے ایک کے پوچھا وہ کون سا فرقہ ہے جو ایک ہوگا اور نجات پائے گا ارشاد فرمایا مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِی جس چیز پر میں ہوں اور میرے صحابہ (جو اس پر چلے گا وہ نجات پانے والا فرقہ ہوگا)

صحابہ کو بھی آپ نے اسی درجے میں لے لیا ہے۔ صحابہ میں دو فرقے تھے دو، چار، پانچ۔ عمل مختلف ہے ایک صحابی رفع یدین کرتے ہیں دوسرے نہیں کرتے۔ ایک صحابی امام کے پیچھے پڑھتے ہیں، دوسرے نہیں پڑھتے ــــ حنفیہ نے تو یہ لے لیا کہ امام کے پیچھے نہیں پڑھنا۔ دوسرے شافعی حضرات نے لے لیا کہ امام کے پیچھے ضرور پڑھیں۔ شافعی یہ کہتے ہیں اور ہم منع کرتے ہیں۔ ہم

کہتے ہیں مکروہ ہے امام کے پیچھے پڑھنا بہت غلط بات ہے۔ وہ صحابہ کرام سے لیا وہ ہمیں صحیح کہتے ہیں ہمیں غلط نہیں کہتے اور ہم اُنہیں یہ نہیں کہتے کہ باطل پر ہیں، امام صاحب کہتے ہیں کہ رفع یدین تھا حتیٰ کہ سجدوں کے بیچ میں بھی تھا۔ یہ جو سجدوں کے درمیان اُٹھ کر بیٹھتے ہیں اللہ اکبر کہہ کے تو رفع یدین کرتے تھے۔ پھر اللہ اکبر کہتے تھے۔

بعد میں یہ کم ہوتا چلا گیا تو متروک ہو گیا اور دلیلیں موجود ہیں اُن کی۔ صحابہ کرام کا عمل موجود ہے اور دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ یہ روایات صحیح ہیں عمل ثابت ہے ہمارا دل مانتا ہے رفع یدین کو وہ رفع یدین کرتے ہیں امام شافعیؒ رفع یدین کرتے ہیں امام مالکؒ نہیں کرتے۔ مالکی حضرات نہیں کرتے حنفی حضرات نہیں کرتے، شافعی کرتے ہیں حنبلی بھی کرتے ہیں۔ رفع یدین تو یہ ہے کیا؟ صحابہ کرام کرتے تھے اور اس میں لڑنا جھگڑنا یہ بھی نہیں ہُوا۔ وہاں ایک آدمی کیسے نماز پڑھ رہا ہے دوسرا کیسے پڑھ رہا ہے اور سارے ساتھ ساتھ پڑھ رہے ہیں اور کوئی اس طرح کی لڑائی جھگڑا نہیں ہے یہ سب کے سب جو صحابہ کرام کے اختلاف کے باوجود کسی بھی صحابی کی پیروی کرلے وہ ہدایت پر ہے اِلّا ملّۃٌ واحدۃٌ کے اندر داخل ہے جس کے بارے میں بشارت دی گئی ہے کہ وہ جنّت میں جائے گا۔ صحابہ کرام میں سے کسی کی بھی پیروی کرنے والا اہلِ سُنّت میں بھی شمار ہوگا اہلِ جماعت میں بھی شمار ہوگا۔ جماعت کا مطلب جماعت صحابہ کی پیروی کرنے والا۔

تو صحابہ کرام کے درجات بہت بلند ہیں یہاں فرمایا گیا کہ اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ صحابہ میرے نجوم ستاروں کی طرح ہیں۔ وہاں فرمایا گیا مَا اَنَا عَلَیْہِ وَ اَصْحَابِیْ نجات پانے والا وہی فرقہ ہے جو اس پر قائم رہے کہ جس پر میں قائم رہا ہوں اور میرے صحابہ کرام قائم رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسلام پر استقامت نصیب فرمائے۔

(قسط: ۴۷)

دربارِ نبویؐ

یعنی بزمِ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات اور آداب

ماخوذ از شمائل ترمذی شریف

حضرۃ شیخ الحدیث مولانا سید محمد میاں رحمہ اللہ کی تصنیف لطیف "سیرۃ مبارکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے چند اوراق

(۱) رحمۃ للعالمین محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک علم وحیاء صبر وامانت سکون واطمینان کی مجلس ہوتی تھی۔

(۲) حاضر وغائب اہلِ مجلس سے ایسا تعلق خاطر رہتا کہ ہر شخص رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا باپ سمجھتا، ہر موقع پر ہر ایک کی خبر گیری ہوتی۔ ساتھیوں میں سے کوئی نظر نہ آتا تو اس کی خیریت معلوم کی جاتی۔ اگر کوئی بیمار ہو جاتا تو اُس کی مزاج پُرسی کے لیے اس کے یہاں تشریف لے جاتے۔ اگر کوئی سفر میں جاتا تو اُس کے لیے دُعا فرماتے رہتے۔ اگر معلوم ہوتا کوئی رنجیدہ ہے تو اس کی دلداری فرماتے۔ اگر کسی سے کوئی خطا ہو جاتی تو اس کا عذر قبول فرماتے۔ آپس کے معاملات کی تحقیق ہوتی۔ پھر اُن کی اصلاح فرمائی جاتی۔ حضورؐ کے دربار میں امیر وغریب۔ کمزور وقوی سب برابر تھے۔ سب ساتھی اس طرح رہتے جیسے ایک باپ کی اولاد۔

(۳) مجلسِ مبارک میں جہاں بھی کوئی ہوتا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشفقانہ انداز سے وہ یہی سمجھتا کہ اس دربار میں سب سے زیادہ خصوصیت اسی خوش نصیب کو حاصل ہے۔

(۴) ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملنا۔ تبسم اور تازہ روئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی پیاری عادت تھی جو اپنی نظیر آپ تھی اور کہیں اس کی نظیر ممکن نہ تھی۔

(۵) جب تک ملنے والا خود نہ اُٹھتا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ اُٹھتے، مگر بہ مجبوری جس کی معذرت فرما لیتے۔

(۶) ذاتِ رسالت مآب (علیہ الصّلوٰۃ والسّلام) کی طرف سے آنے والوں کی عزّت کی جاتی، سلام میں پہل کی جاتی۔ بیٹھنے کو جگہ دی جاتی۔ کبھی خود سیّد الکونین صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنی جگہ سے کھسک کر اپنے پاس بٹھا لیتے۔ پوری احتیاط برتی جاتی کہ ایسی کوئی بات نہ ہو جس سے کسی کا دِل میلا ہو۔

(۷) قبیلہ یا خاندان کا جو بڑا ہوتا اس کی بڑائی مانی جاتی، اس سے بڑائی ہی کا برتاؤ کیا جاتا پھر اپنی طرف سے بھی اسی کو اس قبیلہ یا خاندان کا بڑا بنا دیا جاتا۔ یعنی جس طرح دربارِ رسالت میں باریاب ہونے والوں کا دین محفوظ ہوتا۔ عاقبت دُرست ہوتی۔ اسی طرح اُن کی دُنیا بھی دُرست اور دُنیاوی عزّت بھی محفوظ ہو جاتی۔ (صلّی اللہ علیہ الف الفِ صلوٰتٍ دائمات)

(۸) خاتم الانبیاء سیّد الثقلین صلّی اللہ علیہ وسلّم کو پسند نہ تھا کہ آپ تشریف لائیں تو لوگ تعظیماً اُٹھیں۔ یا آپ تشریف فرما ہوں اور لوگ کھڑے رہیں۔ البتّہ بزم رسالت کی نمایاں شان یہ ہوتی کہ ہر ایک کی دلداری ہوتی۔ ہر ایک کو مانوس کیا جاتا۔ بڑوں کی تعظیم کی جاتی، چھوٹوں پر مہربانی ہوتی مجلسِ مبارک میں افضل وہی مانا جاتا جس کی خیر خواہی عام ہوتی جو تقویٰ طہارت میں اگر سب سے آگے ہوتا تو دوسری طرف خدمتِ خلق۔ مخلوق خدا کی ہمدردی اور خیر اندیشی۔ بندگانِ خدا کے لیے تکلیف برداشت کرنے اور مصیبت جھیلنے میں بھی سب سے پیش پیش ہوتا۔ کمزوروں کی امداد۔ مظلوموں کی فریاد رسی۔ غم زدوں کی غم خواری بے کسوں کی دستگیری میں سب سے بڑھا ہُوا ہوتا۔ یعنی جس طرح ہمارے آقا رحمۃ للعالمین تھے، ایسے ہی وہ بھی خلقِ خدا کے لیے رحمت ہوتا۔ سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ساری اُمّت میں سب سے افضل ہیں اور ان کی خصوصی صفت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ فرمائی ہے۔ ارحم اُمّتی۔ یعنی میری تمام اُمّت میں سب سے زیادہ رحم والا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

(۹) طرزِ نشست میں مساوات کا یہ عالم ہوتا کہ اجنبی شخص کو پُوچھنا پڑھتا کہ شاہِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کہاں ہیں۔ اس کسرِ نفسی کے باوجود یہ معجزہ تھا کہ جیسے ہی کوئی شخص حبیب خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کو پہچانتا، مرعوب ہو جاتا اور اس پر ہیبت طاری ہو جاتی تھی، مگر جیسے ہی بات چیت ہوتی زبانِ مُبارک سے اس طرح پھول جھڑتے اور ایسے موتی برستے کہ اس کی ہیبت محبّت سے بدل جاتی اور وہ آپؐ کا شیدائی ہو جاتا تھا۔ ایک عجیب انداز تھا کہ لوگوں سے ملے جلے بھی رہتے

اور ہر ایک سے بلند و بالا بھی۔ گویا ذاتِ مُبارک سہلِ ممتنع تھی۔

(۱۰) مجلسِ مُبارک میں کبھی پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے۔ لوگوں کے لیے جگہ چھوڑ دیا کرتے۔ اُٹھنے بیٹھنے میں کوئی امتیاز نہ ہوتا۔ آپ کہیں جاتے جہاں جگہ ملتی وہیں بیٹھ جاتے۔ صدر مقام کی کبھی خواہش نہ کرتے یہی آپ کی ہدایت بھی تھی کہ مجلس میں صدر مقام کی خواہش نہ کرو جہاں جگہ ملے بیٹھ جاؤ۔ خاص موقعوں پر ملاقات کے لیے عُمدہ لباس زیبِ تن فرماتے۔ بال وغیرہ بھی دُرست فرما لیتے تھے۔

(۱۱) مجلسِ مبارک میں اہلِ ضرورت ہی کا تذکرہ ہوتا۔ اہلِ مجلس کو ہدایت تھی کہ جو لوگ کسی بھی وجہ سے اپنی ضرورت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم تک نہ پہنچا سکیں مجلس کے ساتھی وہ باتیں پہنچائیں اور اللہ سے ثوابِ عظیم حاصل کریں۔

(۱۲) مجلسِ مُبارک میں وقت کی پُوری قدر کی جاتی۔ کام کی باتیں جن میں مخلوق کا فائدہ اور خالق سے ثواب کی توقع ہو، خوشی سے سُنی جاتیں اُنہی میں دِل چسپی لی جاتی۔ آنے والے دین کے طالب بن کر آتے اور رشد و ہدایت کی شمع بن کر جاتے، ان کو ہدایت ہوتی کہ جو کچھ اُنھوں نے حاصل کیا ہے اس کو عوام تک پہنچائیں۔

(۱۳) بات چیت ہوتی تو کسی کی بات کاٹی نہ جاتی۔ جس نے بات شروع کی پہلے اس کی بات پوری ہو لیتی تب کسی دوسرے کو بولنے کا حق ہوتا۔ جب کوئی بولتا سب خاموشی سے اس کی پُوری بات سُنتے اگر خود سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کچھ ارشاد فرماتے تو گویا حاضرین پر سکتہ چھا جاتا۔ فرطِ شوق اور غایتہ احترام میں ایسے ہو جاتے جیسے قالب بے جان!

(۱۴) لوگوں کے حالات اور عوام کے رجحانات کی پوری معلومات رکھی جاتی۔ کوئی اچھا رجحان پایا جاتا تو اس کو تقویت دی جاتی۔ کسی بُری بات کا پتہ چلتا تو اس کی روک تھام کی جاتی اچھی باتوں کی خوبیاں اور جو بُری باتیں ہوتیں اُن کی خرابیاں سمجھا کر ذہن نشین کرائی جاتیں۔

(۱۵) ہر بات اور ہر عمل میں اعتدال سے کام لیا جاتا، ہر کام کے لیے مناسب انتظام ہوتا جو باتیں چھپانے کی ہوتیں وہ امانت سمجھی جاتیں، اہلِ ضرورت اور مسافروں کی پُوری خبر گیری کی جاتی۔

(۱۶) آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم خوش طبعی بھی فرما لیتے تھے، مگر کوئی جھوٹی بات کبھی زبانِ مُبارک پر نہ آتی تھی۔ حاضرینِ مجلس آپس میں ہنستے بولتے۔ پہلے زمانہ کی باتیں کیا کرتے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ

وسلّم خاموش بیٹھے سُنتے رہتے وہ کسی بات پر ہنستے تو آپ بھی مُسکرا دیتے۔

(۱۷) اُٹھنا، بیٹھنا۔ غرض تمام باتیں اللہ کے ذکر کے ساتھ ہوتیں۔

(۱۸) حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ اقدس تین باتوں سے ہمیشہ محفوظ رہی، جھگڑا، تکبّر، بیکار باتیں اور سیّد الکونین نے تین باتوں سے ہمیشہ ہر ایک کو محفوظ رکھا۔ مذمّت، عیب جوئی، پوشیدہ باتوں کا اظہار۔

یا ربّ صلّ وسلّم دائمًا ابدًا　　علیٰ حبیبك خیر الخلق کلھم

○

آئینہ قرآن میں تصویرِ تزکیہ

مقاصدِ بعثت کامیاب۔ حضرت حق جلّ مجدہ کی تصدیق

(۱) وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا　(سورۃ ۴۸ الفتح آیت ۲۶)

اور جما دیا ان کو تقویٰ کی بات پر اور وہ اُس کے زیادہ مستحق ہیں اور اُس کے اہل ہیں اور اللہ ہر چیز کو خُوب جانتا ہے۔

(۲) وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ　(الحجرات ع ۱)

لیکن اللہ تعالیٰ نے محبّت بھر دی تم میں ایمان کی اور سجا دیا، اس کو تمہارے دلوں میں اور نفرت بھر دی تمہارے اندر کُفر سے فسق سے اور عصیان (خدا کی نافرمانی) سے یہی ہیں وہ جو راشد ہیں (راہ راست پر ہیں) اللہ تعالیٰ کے فضل اور انعام سے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔

سیّدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ علیہما الصلوٰۃ والسّلام کے دُعائیہ کلمات دیکھیے خصوصًا یہ کلمات

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ

اور ہماری نسل میں سے ایسی اُمّت پیدا کر دے جو تیرے حکموں کی فرماں بردار ہو۔
(آیت ۱۲۸ سورۃ ۲ بقرہ)

پھر مقاصد بعثت پر نظر ڈالیے اور موازنہ کیجیے کہ مذکورہ بالا آیات کس طرح کامیابی مقاصد کی شہادت دے رہی ہیں۔ رحمۃ للعالمین۔ خاتم الانبیاء والمرسلین صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جس اُمّت کے سامنے کتاب کی تلاوت کی، جس کو کتاب وحکمت کی تعلیم دی جس کا تزکیہ کیا۔ آیاتِ مندرجہ بالا کی شہادت یہ ہے کہ بلا کسی استثناء کے وہ سب اس تعلیم کے صرف عالم ہی نہیں بلکہ عامل بھی اتنے بڑے ہو گئے کہ

۱۔ وہ کلمۃ التقوٰی پر ثابت قدم ہیں۔
۲۔ اتّفاقیہ نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ اس کے اہل ہیں کیونکہ
۳۔ ایمان کی محبّت اُن کے دِلوں میں بھر دی گئی ہے۔
۴۔ اس محبّت کا نتیجہ یہ ہے کہ

(الف) ان کے قلوب زیورِ ایمان سے آراستہ ہو گئے ہیں۔
(ب) ایمان۔ اسلام اور تقوٰی کی مخالف خصلتیں کُفر۔ فسق اور عصیان سے اُن کے دِل متنفر ہو گئے ہیں اور اَب حسبِ ارشاد آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم شان یہ ہے اصحابی کالنجوم[1] بایھم اقتدیتم اھتدیتم (مشکوٰۃ شریف بروایت رزین) میرے اصحاب تاروں کی طرح ہیں جس کے راستے پر چلو گے ہدایت پالو گے۔ اور اسی بنا پر حضرت جلّ مجدہ کا اعلان یہ ہے (رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ) (سورۃ ۵۸ مجادلہ آیت ۲۲) اللہ اُن سے راضی اور وہ خدا سے راضی ہو گئے۔

حج البیت

وَ لِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً۔ (سورۃ آل عمران آیت)

---

[1] حدیث اگرچہ سند کے لحاظ سے قوی نہیں مانی جاتی، مگر اس کا مضمون وہ ہے کہ قرآن پاک کی آیتیں اس کی تائید اور تصدیق کر رہی ہیں۔ لہٰذا حدیث اپنے مفہوم کے لحاظ سے قوی ہے۔

اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر حج کرنا اس بیت کی جو کوئی پاتے اس تک راہ۔ (شاہ صاحبؒ)

رب اکبر کے بیت الحرام کی بُنیادیں بلند کرتے ہُوئے حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السّلام نے اُمّتِ مسلمہ اور اس کے لیے رسول کی وہ دُعاء کی تھی جس کی ضیاء پاشی کا تذکرہ پہلے صفحات میں گزرا۔ اسی وقت حضرت ابراھیم علیہ السّلام نے حضرت حق جل مجدہٗ کے اس حکم کی تعمیل بھی کی تھی۔

اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجّ (سورۃ ۲۲ الحج آیت ۲۷)

لوگوں میں حج کا اعلان پکار دے۔

یہ رسُول موعود محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنے مورثِ اعلیٰ کی مِلّت "مِلّتِ ابراھیم" کا احیاء کرتے ہُوئے بحکم خدا خانۂ کعبہ کو قبلہ بنا چکے تھے، لیکن اعلانِ حج کا جو تقاضا تھا۔

یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ (آیت ۲۷ سورۃ حج)

آئیں گے تیرے پاس پا پیادہ اور دُبلے پتلے اُونٹوں پر جو دُور دراز راستوں سے آئیں گے۔

یہ تقاضا پُورا نہیں ہوسکا تھا اور کیسے پُورا ہوتا جب کہ خانۂ کعبہ پر قریش کا قبضہ تھا۔ اور اُنھوں نے اس مرکزِ توحید کو کفر و شرک کا تیرتھ بنا رکھا تھا۔

لیکن مِلّتِ ابراھیمی کے فداکاروں میں جو جذبہ تحوِیلِ قبلہ کے لیے تھا۔ وہی جذبہ اور ممکن ہے اس سے زیادہ جذبہ اور شوق اس کا ہو کہ اعلانِ ابراھیمی کے تقاضے کو پُورا کریں۔ اُس جذب و اضطراب کو بڑا سکون وارثِ ابراہیم خلیل اللہ محبوبِ رب العالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اس خواب سے ہُوا کہ:

"سر منڈاتے ہُوئے یا بال کترواتے ہُوئے مسجدِ حرام میں داخل ہو رہے ہیں۔"

اسی دَور میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے عمرہ کا ارادہ فرمایا، لیکن جب چودہ سو مؤمنین صالحین کے پُورے قافلہ اور اُن کے آقا اور قائد کو (صلّی اللہ علیہ وسلّم) مقام حدیبیہ پر روک دیا گیا۔ پھر صلح ہُوئی تو نہایت دَبی ہُوئی شرطوں پر جن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اس وقت نہ عمرہ کریں نہ مکّے میں داخل ہوں۔ اس وقت حدیبیہ ہی سے واپس ہوجائیں، آئندہ سال آسکتے ہیں، مگر خاص خاص پابندیوں کے ساتھ کہ اسلحہ کم سے کم ہوں اور وہ بھی نیاموں میں بند ہوں۔ صرف تین دن قیام کریں (وغیرہ وغیرہ)، تو ایک مایوسی لازمی تھی، لیکن وحی الٰہی نے جس طرح اس دبی ہُوئی صلح کو فتح مبین فرمایا، مایوس

دِلوں کو یہ بشارت دے کر تازگی بخشی کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب اللہ کے رسولؐ کا خواب پُورا ہوگا۔

"تم مسجد حرام میں انشاء اللہ ضرور جاؤ گے امن و امان کے ساتھ کہ تم میں کوئی سر منڈائے ہوگا، کوئی بال کتراتا ہُوا کسی طرح کا اندیشہ نہ ہوگا۔" (سورۃ ۴۸ الفتح آیت ۲۷)

وحی الٰہی سراسر صداقت ہوتی ہے۔ ایک سال بعد اُن سب نے عُمرہ کیا جن کو بشارت دی گئی تھی۔ پھر جب ۸ھ میں مکّہ معظّمہ فتح ہو چکا تو ۹ھ میں خواب کی تعبیر اس شان سے جلوہ گر ہوئی جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

حج اِسلام اور اعلانِ برأت ۹ھ

رمضان شریف ۸ھ میں مکّہ فتح ہُوا، مگر چونکہ فوراً ہی حنین و اَوطاس کے معرکے پیش آگئے۔ پھر طائف کے محاصرہ میں تقریباً ایک مہینہ لگ گیا۔ اس لیے اس سال حج کا انتظام پہلے ہی ہاتھوں میں رہا۔ صرف حج کے ارکان مسلمانوں نے حضرت عتاب بن اُسید (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ ادا کیے جو مکّہ معظّمہ کے امیر (گورنر) مقرّر کیے گئے تھے۔

اب مکّہ فتح ہُوئے ایک سال ہو چکا ہے، نہ صرف مکّہ کے باشندے بلکہ قریب قریب عرب کے تمام ہی قبیلے مُسلمان ہو چکے ہیں۔

پہلے عرب[1] کفّار و مشرکین کا تھا۔ اب عرب مُسلمانوں کا بن چکا ہے۔ لہٰذا اس سال حج کا انتظام اپنے

---

[1] عرب کے باشندے چونکہ قریش کے زیرِ اثر تھے اس لیے اسلام لانے میں بھی قریش کے رویّہ پر ان کی نظر تھی۔ صلح حدیبیہ نے اُن کے خیالات میں تبدیلی پیدا کی۔ مسلمانوں کو تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ لہٰذا اسلام قبائل میں پھیلنے لگا اور جب مکّہ فتح ہو چکا اور قریش حلقہ بگوشِ اسلام بن گئے تو اب تمام رکاوٹیں ختم ہوگئیں۔ اَب ہر قبیلہ اسلام کی طرف لپکنے لگا اور وہ اسلام جو گزشتہ ۲۱ سال میں چیونٹی کی حال چلا تھا۔ اَب وہ ایک سیلاب بن گیا جس کی لہریں عرب کے کناروں کو چھونے لگیں

ہاتھ میں لیا جا رہا ہے، مگر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم بہ نفسِ نفیس اس سال بھی تشریف نہیں لے جا سکے۔[1]
لہٰذا حضرت صدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو قائم مقام بنایا گیا اور تین سو صحابہ کے ساتھ حج ادا کرنے کے لیے روانہ
فرما دیا گیا۔ بعد میں حسبِ ارشاد رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلّم، سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ[2] بھی
خصوصی اعلان کے لیے پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلام کی تعلیم کے مطابق حج کرایا۔ حج کے زمانہ میں
وہ خداوندی اعلان[3] بار بار سُنایا جس کی ہدایت سورہ برأت کے شروع میں کی گئی ہے کہ:
۱- وہ لوگ جو معاہدے کے پابند رہے ہیں ان کے معاہدے اپنی مدّت تک باقی رہیں گے۔

---

[1] اس لیے کہ خانہ کعبہ اگرچہ نشاناتِ شرک سے پاک ہو چکا تھا، مگر سلسلہ حج اس طرح پاک نہیں ہوا تھا، کیونکہ مشرکین بھی آتے تھے اور اُن کی مشرکانہ رسوم اور وحشیانہ حرکتیں (مثلاً برہنہ حج کرنا) باقی تھیں حج میں اس سال ان کی ممانعت کا اعلان کر کے مناسکِ حج کو پاک کرنا تھا اور اس لیے بھی آپ تشریف نہیں لے گئے کہ "نسی" یعنی لوند کی وجہ سے جو مہینوں کی ترتیب بگڑی ہوئی تھی وہ دُرست نہیں ہوئی تھی۔ یہ ترتیب اگلے سال درست ہوئی جس سال آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حج فرمایا اسی موقعہ پر آپ نے ارشاد فرمایا تھا۔ ان الزمان قد استدار کھیئتہٖ یوم خلق اللہ السّمٰوٰتِ والارض (بخاری شریف ص۶۷۲) زمانہ کی جو ترتیب اس روز تھی جس روز اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین پیدا کیے تھے اسی ترتیب پر لوٹ آیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[2] اس موقع پر بھی پوری اہمیّت کے ساتھ یہ اعلان کرنا تھا کہ جو کفّار و مشرکین عہد نامہ کی خلاف ورزی کر چکے ہیں ان کا معاہدہ مسلمانوں کی طرف سے بھی منسوخ کیا جاتا ہے اور آئندہ اس کی ذمّہ داری سے برأت کی جاتی ہے اس قسم کے اہم اعلان کے لیے عربوں کے قاعدہ کے مطابق ضروری تھا کہ خود صاحبِ معاملہ اعلان کرے یا کوئی اس کا صلبی عزیز اعلان کرے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ شرف حاصل تھا۔ کیونکہ آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے چچازاد بھائی تھے۔ لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا تاکہ مشرکین کو حیلہ بہانہ کا موقع نہ رہے۔

[3] ۱۰ ذی الحجہ جس کو یوم النحر کہا جاتا ہے۔ اس روز حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ نے منیٰ کے عام اجتماع میں اعلان کیا کہ آئندہ کوئی مشرک خانہ کعبہ میں نہیں داخل ہو سکے گا۔ نہ کوئی شخص برہنہ بدن طواف کر سکے گا۔ (بخاری شریف) پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سورۃ برأت کی ابتدائی آیتیں پڑھیں جن میں مذکورہ بالا امور کا اعلان ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرات نے اس اعلان کی اس طرح زور زور سے تشہیر کی کہ اُنکے گلے پڑ گئے (سیرۃ ابن ہشام)

(بقیہ ص ۵۲)

مولانا سیّد محمود میاں صاحب

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی نجی زندگی

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

امّا بعد انسان کی سیرت اور کردار کی تعمیر اس کے دُنیا میں آتے ہی شروع ہو جاتی ہے بلکہ اسلامی تعلیمات میں اس بات کے بھی اشارے ملتے ہیں کہ سیرت و کردار کی تعمیر جسمانی تعمیر کے ساتھ ساتھ بطنِ مادر ہی میں شروع ہو جاتی ہے۔ طبی تحقیقات بھی اس پر کافی شاہد ہیں۔ انسان کی سیرت اور مزاج کے ظہور کی دو جگہیں ہوتی ہیں ایک گھر کے اندر دوسری گھر سے باہر کی شہری اور مدنی زندگی عام طور پر انسان کا گھریلو مزاج وطبیعت بیرونی مزاج وطبیعت سے مختلف ہوتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص کی گھریلو زندگی اور بیرونی زندگی ایک جیسی معتدل متوازن اور اعلیٰ اخلاق کی حامل ہو، البتہ انسان کے اعلیٰ اخلاق اور معتدل مزاجی کے پرکھنے کی اصل کسوٹی اس کی نجی اور گھریلو زندگی ہی ہوتی ہے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آیا اس کی بیرونی اور شہری زندگی کے معاملات اور افعال حقیقت پر مبنی ہیں یا مصنوعی پن اور اداکاری پر مشتمل ہیں موجودہ مغرب زدہ دَور میں انسان کی نجی زندگی سے بحث نہیں کی جاتی بلکہ اس سے بحث کرنا ایک معاشرتی خطا اور لغزش قرار دیا جاتا ہے۔ مغرب اور اکثر غیر مسلم اقوام میں یہی اُصول کارفرما ہے جس نے وہاں کے عائلی اور خاندانی نظام کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے جس کے نتیجہ میں جانوروں جیسے مادر پدر آزاد معاشرے نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ بد قسمتی سے مغرب کی نقالی کی بدولت یہی خرابیاں ہمارے مسلم معاشرے میں بھی جڑیں پکڑتی جارہی ہیں۔

اسلام ہر فرد اور خاص طور پر ایسے افراد کی نجی زندگی کے گوشوں پر گہری نظر رکھتا ہے جو معاشرے اور سوسائٹی کے اجتماعی مسائل کا بار اُٹھائے ہوتے ہوں یا اس کی خواہش رکھتے ہوں کیونکہ نجی زندگی

کے ابتدائی اور سخت امتحان میں کامیابی کی صورت میں ہی ان سے بیرونی امتحان و آزمائش میں کامیابی کی توقع کی جا سکتی ہے۔

اس لیے ہم محسن انسانیت رحمۃ للعالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی گھریلو زندگی چند حالات پیش کریں گے جن سے نجی زندگی میں رہنمائی کے ساتھ ساتھ آپ کی بلند نظری اعلیٰ ظرفی اور اخلاقِ عظیمہ کی شان نمایاں ہوتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ جن نظریات و افکار کی تعلیم آپ اُمّت کو دے رہے ہیں وہ حقیقت اور سچائی پر مبنی ہیں آپ سب سے پہلے خود اس تعلیم سے متأثّر ہیں اور اس پر عمل کر رہے ہیں بعد میں دوسروں کو اس کی دعوت دے رہے ہیں۔

اس بات کی شہادت اللہ کا کلام ان الفاظ میں دیتا ہے "اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" بلا شک و شُبہہ آپ اخلاق کے بلند ترین مرتبہ پر فائز ہیں۔

خانگی زندگی میں آپ کے اپنی ازواج مطہرات اولاد عزیز و اقارب خدام اور غلاموں سے رویّے اور حسن سلوک کے چند واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپ نے فرمایا "خیرکم خیرکم لا ھلہ و انا خیرکم لا ھلی" تم میں وہ شخص بہت اچھا ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے اچھا ہو اور میں تم سب سے بڑھ کر اپنے گھر والوں کے لیے اچھا ہوں، ہمہ جہت مصروفیات کے باوجود جو آپ کو ہر وقت در پیش رہتی تھیں آپ اپنی اولاد اور اہل خانہ کی تعلیم و تربیت اور حقوق کی ادائیگی کا پوری طرح خیال رکھا کرتے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ کبھی آپ اپنی ازواج کو سال بھر کا نفقہ یکبارگی عنایت فرما دیا کرتے، لیکن آپ کی تربیت کا اُن پر ایسا گہرا اثر تھا کہ وہ از خود اپنے نفقہ میں سے فقراء پر خرچ کرتی رہتی تھیں یہاں تک کہ کچھ باقی نہ رہتا۔ آپ گھر کے معمولی کام اپنے دستِ مبارک سے خود انجام دیتے اور اس میں بالکل عار محسوس نہ فرماتے۔ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت اسودؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ نبی علیہ السّلام کی گھر میں کیا مصروفیات ہوتی تھیں۔ اُنھوں نے فرمایا "یکون فی مھنۃ اھلہ تعنی خدمۃ اھلہ فاذا حضرت الصلوۃ خرج الی الصلوۃ یعنی آپ اپنے گھر والوں کے ساتھ کام کاج میں لگے رہتے تھے۔ جب نماز کا وقت ہوتا تو نماز کے لیے تشریف لے جاتے۔

حضرت عائشہ رضؓ ایک دوسری حدیث میں فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اپنا جوتا گانٹھ

لیا کرتے اور اپنا کپڑا سی لیا کرتے اور اپنے گھر کے کام اس طرح انجام دیتے جیسے تم میں سے کوئی اپنے گھر میں کام کرتا ہے۔ اُنھوں نے فرمایا آپ بشر تھے... بکری کا دودھ خود نکال لیا کرتے تھے اور اپنے کام خود کر لیتے تھے۔ (ترمذی کذا فی المشکوٰۃ ص ۵۲۰ ج ۲)

گھر میں آپ کی گفتگو کا انداز بھی بہت اچھا ہوتا۔ حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں "لم یکن یسرد الحدیث کسردکم کان یحدث حدیثا لو عدّہ العادّ لاحصاہ" (متفق علیہ کذا فی المشکوۃ) یعنی نبی علیہ السلام تم لوگوں کی طرح تیز تیز (تڑتڑ) نہیں بولا کرتے تھے بلکہ آپ کی گفتگو ایسی ٹھہر ٹھہر کر ہوتی تھی کہ اگر کوئی اس کو محفوظ کرنا چاہتا تو کر لیتا۔

حضرت عائشہ رضؓ آپ کے اندر انتہائی ضبط اور قوتِ برداشت کی شہادت دیتے ہوئے فرماتی ہیں ماضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیأ قط بیدہ ولا امرأۃ ولا خادما الا ان یجاھد فی سبیل اللہ وما نیل منہ شئ قط فینتقم من صاحبہ الا ان ینتھک شئ من محارم اللہ فینتقم للہ۔ (رواہ مسلم کذا فی المشکوۃ ص ۵۱۹ ج ۲)

آپ نے اپنے ہاتھ سے بیوی اور خادم میں سے کسی کو کبھی معمولی سا بھی نہیں مارا سوائے اس کے کہ آپ (مجاہد تھے) اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے تھے اور ایسا بھی کبھی نہیں ہوا کہ آپ کی ذات کو کسی سے تکلیف پہنچی ہو اور آپ نے تکلیف پہنچانے والے سے انتقام لیا ہو الّا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ کوئی چیز پامال کی گئی ہو تو اس کا آپ اللہ کے لیے انتقام لیتے واقعی ایک مجاہد اور نبی کی شان ایسی ہی ہونی چاہیے کہ اس کی دوستی اور اس کا انتقام صرف اللہ کے لیے ہو اپنی ذات کے لیے نہیں آپ کے قلب مبارک میں اللہ تعالیٰ کی حدود کا اس درجہ احترام تھا کہ ایک بار چوری ثابت ہو جانے پر کسی قریشی خاتون کے ہاتھ کاٹنے کا حکم فرمایا۔ خاتون کے خاندان والوں نے اس کے لیے سفارش کرائی آنجنابؐ بہت خفا ہوئے اور فرمایا کہ اگر میری بیٹی فاطمہ بنت محمدؐ نے بھی چوری کی ہوتی تو میں اُن کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا حالانکہ حضرت فاطمہ رضؓ آپ کی بہت چہیتی صاحبزادی تھیں اس ارشاد سے غیروں کے ساتھ ساتھ آپ نے اپنے عزیز و اقارب کو بھی خبردار فرمایا کہ میری قرابت کے سبب حدود اللہ میں مجھ سے کوئی رعایت کی توقع نہ رکھے آپ کے اپنی ازواج سے تعلقات کس قدر خوشگوار تھے اس کا اندازہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے وہ فرماتی ہیں میں ایام مخصوصہ میں پانی

پیتی پھر پانی کا وہ برتن نبی علیہ السلام کو دے دیتی تو آپ برتن کے کنارے پر اُسی جگہ لب مبارک رکھتے جہاں میں نے رکھے ہوتے تھے اسی طرح میں دانتوں سے ہڈی پر سے گوشت کھالیتی۔ پھر وہ ہڈی نبی علیہ السّلام کو دیتی آپ دندان مُبارک سے اُسی جگہ سے گوشت نوچتے جہاں سے مَیں نے نوچا ہوتا۔

(رواہ مسلم کذافی المشکواۃ ص۵۶ ج۱)

ایک اور جگہ ارشاد فرماتی ہیں کہ ایّام مخصوصہ میں میری گود میں آپ ٹیک لگاتے پھر تلاوت قرآن پاک فرماتے (متفق علیہ کذا فی المشکوٰۃ ص۵۶) اسی نوعیّت کے بہت سے واقعات دیگر ازواج مطہرات کے بھی احادیث میں منقول ہیں ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اپنے نبوی رعب اور دبدبے کو شوہر وزن کی باہمی بے تکلفی میں حائل نہ ہونے دیتے اور اس قسم کے حجابات کو ازخود ختم فرمادیتے تاکہ فطری جذبات کی پوری طرح تکمیل ہو۔ اسی طرح افراد خانہ میں سے کسی سے ایسی غلطی سرزد ہو جاتی جو اُن کی شان کے خلاف ہوتی تو آپ فوراً مناسب تادیبی کارروائی فرماتے حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں قلت للنبی صلّی اللہ علیہ وسلّم حسبك من صفیۃ کذا وکذا تعنی قصیرۃً فقال لقد قلتِ کلمۃ لومزج بھا البحر لمزجتہ (مشکوٰۃ ص۴۱۴ ج۲)

ترجمہ: مَیں نے کسی بات پر حضرت صفیہ رضؓ کے بارے میں نبی علیہ السّلام سے کہا کہ آپ کو تو بس صفیہ کافی ہیں۔ ایسی ویسی ہیں اُن کی مُراد ان کا چھوٹا قد تھا۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے ایسا خراب جملہ کہا ہے کہ اگر اسکو سمندر میں ملادیا جائے تو سارا سمندر عیب دار ہوجائے، ایک اور جگہ آپ کے گھریلو خادمِ خاص حضرت انس رضؓ فرماتے ہیں کہ حضرت صفیہ رضؓ کو یہ بات پہنچی کہ حضرت حفصہ رضؓ نے انہیں یہودی کی بیٹی کہا ہے تو وہ رو پڑیں اس دوران نبی علیہ السلام تشریف لے آتے اور دریافت فرمایا کہ تمہیں کس چیز نے رُلایا ہے تو اُنھوں نے شکایت کی کہ مجھے حفصہ نے یہودی کی بیٹی کہا ہے نبی علیہ اسلام نے تسلّی دی اور فرمایا کہ تم تو نبی کی اولاد ہو (یعنی حضرت ہارون علیہ السلام کی) اور تمہارے چچا بھی نبی تھے (یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام) اور اَب تم نبی کی بیوی ہو تو کیوں کر حفصہ تمہارے مقابلہ میں فخر کرتی ہیں۔

پھر آپ نے حضرت حفصہ رضؓ سے فرمایا اے حفصہ تم اللہ سے ڈرو (رواہ الترمذی کذا فی المشکوٰۃ ص۵۷۳ ج۲)

آپ اپنی اولاد سے بھی بہت محبّت فرماتے تھے۔ حضرت انس رضؓ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی علیہ السلام سے زیادہ اپنے عیال سے محبّت کرنے والا نہیں دیکھا آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم علیہ السلام عوالی

مدینہ میں ایک خاتون کی سپرداری میں تھے جو دُودھ پلایا کرتی تھیں آپ ہمارے ساتھ وہاں تشریف لے جاتے ان کو گود میں لیتے اور چومتے پھر واپس تشریف لے آتے۔ (رواہ مسلم کذا فی المشکوٰۃ ص ۵۲۰ ج ۲)

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی علیہ السلام کو اس حال میں دیکھا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ آپ کے کاندھے پر تھے اور آپ ان کو یہ دُعا دے رہے تھے۔ اللّٰھم انی اُحِبُّہ فَاَحِبَّہ اے اللہ مجھے ان سے محبّت ہے تو بھی ان سے محبّت فرما۔ (متفق علیہ کذا فی المشکوٰۃ ص ۵۶۸ ج ۲)

اسی طرح کا ایک اور واقعہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ دن کے کسی حصّہ میں میں نبی علیہ السلام کے ساتھ نکلا حتّٰی کہ آپ حضرت فاطمہ رضؓ کے حجرہ پر تشریف لائے اور دریافت فرمایا کیا چھوٹو اِدھر ہے کیا چھوٹو اِدھر ہے۔ آپ کا سوال حضرت حسن رضؓ کے بارے میں تھا۔ اتنے میں حضرت حسن رضؓ دوڑے دوڑے آئے (جو کہ اس وقت بہت چھوٹے بچّے تھے) اور ایک دوسرے کے گلے لگ گئے، پھر آپ نے فرمایا اے اللہ مجھے ان سے محبّت ہے تو بھی ان سے محبّت فرما اور جو اُن سے محبّت رکھے ان سے بھی محبّت فرما۔ ایضاً۔

آپ اپنی چہیتی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضؓ سے بہت شفقت کا معاملہ فرماتے تھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت فاطمہ رضؓ سے بڑھ کر نبی علیہ السلام سے مشابہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا، وہ بات چیت شکل وصُورت اور سیرت میں نبی علیہ السلام سے سب سے زیادہ مشابہ تھیں وہ جب آپ کے پاس آیا کرتیں تو آپ اُن کے استقبال کے لیے کھڑے ہوتے ان کا ہاتھ پکڑتے ان کو چومتے اور اپنی جگہ ان کو بٹھاتے اسی طرح جب آپ ان کے پاس تشریف لے جاتے تو وہ آپ کے استقبال کے لیے کھڑی ہو جاتیں آپ کا دست مُبارک پکڑتیں آپ کو چومتیں اور اپنی جگہ پر بٹھلا دیتیں۔

حدیث شریف کے الفاظ اس طرح ہیں کانت اذا دخلت علیہ قام الیہا فاخذ بیدھا فقبلھا واجلسھا فی مجلسہ وکان اذا دخل علیھا قامت الیہ فاخذت بیدہ فقبلتہ واجلستہ فی مجلسھا۔ (ابوداؤد کذا فی المشکوۃ ص ۴۰۲ ج ۲)

گھریلو خدّام اور غلاموں کے ساتھ آپ کا رویّہ انتہائی مشفقانہ اور خدا ترسی پر مبنی تھا حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جو آپ کی جاں نثار زوجہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے غلام تھے ان کو حضرت خدیجہ رضؓ نے بطورِ ہدیہ نبی علیہ السّلام کی خدمت میں پیش کر دیا نبی علیہ السّلام نے اُن کو آزاد کر دیا لیکن وہ نبی

علیہ السلام کی خدمت ہی میں رہے۔ آپ نے اُن کو منہ بولا بیٹا بنا لیا اور بیٹوں جیسا معاملہ اُن کے ساتھ رکھا حتّٰی کہ لوگ ان کو سچ مچ نبی علیہ السّلام کا بیٹا سمجھنے لگے اور زید بن محمد کہہ کر پکارا کرتے حضرت زید کے بھائی جبلہ بن حارثہ کو پتہ چلا کہ اُن کے بھائی مکّہ مکرمہ میں ہیں تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ میرے بھائی کو میرے ساتھ وطن واپس بھیج دیجیے آپ نے فرمایا یہ تمہارے سامنے ہیں اگر تمہارے ساتھ جانا چاہتے ہیں تو میں ان کو نہیں روکوں گا۔ اس پر حضرت زیدؓ نے نبی علیہ السلام کو جواب دیا یا رسولَ اللہ لا اختار علیك احدًا یعنی اے اللہ کے رسول اللہ کی قسم میں آپ پر کسی دوسرے کو ترجیح نہیں دے سکتا (اور بھائی کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا) ان کے بھائی کہا کرتے تھے۔ فرأیتُ رائ اخی افضل من رائی " میں دیکھتا ہوں کہ میرے بھائی کی رائے میری رائے سے بہتر تھی۔

(ترمذی کذا فی المشکوٰة ص ۵۷۱ ج ۲)

اس قسم کے دسیوں واقعات ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا اپنے ذاتی خدام سے سلوک اتنا اچھا تھا کہ وہ آپ کے جانثار ہو جاتے اور برضاء و رغبت تمام زندگی آپ کی خدمت میں گزار دیتے اور آپ سے ایک لمحہ کی جدائی بھی ان کو گوارہ نہ ہوتی۔ مذکورہ بالا واقعات سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ زندگی کے ہر پہلو کے اعتبار سے جس طرح سب پر ممتاز اور برتر ہیں اسی طرح نجی زندگی کے اعتبار سے بھی آپ کا ہمسر اور ہم پلّہ کوئی نہیں ہو سکتا لہٰذا بجز اس بات کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم زندگی کے ہر شعبہ میں آنکھیں بند کر کے آپ کی پیروی کریں کیونکہ دُنیا و آخرت کی کامیابیاں اور فلاح اسی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ البتّہ تمہارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنی شب و روز کی زندگی آپ کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق گزاریں۔

حضرت مولانا عاشق الٰہی بلند شہری مدظلہم (قسط: ۴)

حیلے اور بہانے

اہل وعیال کو دین پر چلانے کی ذمّہ داری

یہ بہت ضروری امر ہے کہ جب بھی آدمی بیوی والا بنے، اپنی بیوی کو دین پر چلانے کے لیے فکرمند ہو، پھر جب صاحب اولاد ہو تو اُن کو بھی دینی زندگی پر ڈالے اور دینی احکام پر چلائے۔ صرف کھلانا پلانا اور اچھے کپڑے پہنانا ہی، بچّوں کی محبّت نہیں ہے، اس سے بڑھ کر ان کی محبّت یہ ہے کہ ان کو دین پر ڈالیں آخرت کا فکرمند بنائیں۔ فرائض و واجبات سکھائیں، احکامِ شریعت بتائیں اور گناہوں سے بچائیں، جن باتوں سے بیوی بچّوں کی آخرت سنورتی ہو جنّت ملتی ہو اور دوزخ سے حفاظت ہوتی ہو، درحقیقت اُنہی میں اُن کا فائدہ ہے۔ شروع سے ہی ایسی ترتیب بنانا لازم ہے کہ بیوی بچّے کنٹرول میں رہیں اور دین پر رضا اور رغبت سے چلیں، نرمی سے گرمی سے، پیار و محبّت سے، جس طرح بن پڑے اُن کو دین پر چلائیں۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے۔

وَ اَنْفِقْ عَلٰى عِيَالِكَ مِنْ طَوْلِكَ وَلَا تَرْفَعْ عَنْهُمْ عَصَاكَ اَدَبًا وَاَخِفْهُمْ فِى اللّٰهِ۔	اور اپنے اہل وعیال پر اپنا مال خرچ کر اور ادب سکھانے کی وجہ سے اپنی لاٹھی ان سے اُٹھا کر مت رکھ، اور ان کو اللہ کے احکام کے بارے میں ڈراتا رہ (مشکوٰۃ المصابیح ص۱۸)

جہاں یہ نصیحت فرمائی کہ اہل وعیال پر اپنا مال خرچ کرو، وہاں یہ بھی فرمایا کہ ان کی طرف سے غافل ہو کر لاٹھی اُٹھا کر مت رکھو جس کا یہ مطلب ہے کہ ان کی تعلیم و تادیب میں کوتاہی نہ کرو اور ان کو نہ یہ سمجھنے دو کہ والد کو ہماری دینداری کا فکر نہیں ہے، ان کو دین پر ڈالنے کے لیے سختی کرو، ان کے اعمال و احوال کی نگرانی کرتے رہو۔ ڈانٹ اور مارپیٹ سے بھی بوقت ضرورت دریغ نہ کرو۔ وہ ڈھیلا پن محسوس نہ کریں۔ ان کے ساتھ ایسا معاملہ رکھو کہ وہ یہ سمجھنے پر

مجبور رہیں کہ اگر ہم نے دینی کاموں میں کوتاہی کی تو مار پڑے گی۔

حکمت کا جو بھی تقاضا ہو اس پر عمل کریں۔ بچّوں کو سمجھائیں کہ دُنیا فانی ہے اور آخرت باقی ہے اور اللہ تعالیٰ خالق و مالک ہے۔ اس کی معرفت ضروری ہے، اس کی اطاعت اور فرمانبرداری سے دُنیا و آخرت سنورتی ہے وہ رحیم و کریم ہے اور شدید العقاب بھی ہے اس سے اُمّید بھی رکھیں اور ڈرتے بھی رہیں جب ان کو شروع سے اس طریقہ پر چلائیں گے تو وہ انشاء اللہ تعالیٰ احکامِ شریعت پر دل و جان سے چلیں گے اور گناہوں سے نہ صرف یہ کہ خود بچیں گے، دوسروں کو بھی بچائیں گے

اولاد کو دیندار بنانا عیب سمجھا جاتا ہے

آجکل لوگوں کا یہ طریقہ ہے کہ اولاد کو دین دار بنانے کو عیب سمجھتے ہیں پیدائش کے دن ہی سے ان کے لیے کافروں کی وضع اور کافروں کا لباس اور کافروں کے طور طریق پسند کرتے ہیں، قرآن و حدیث اور اسلامی احکام و آداب پڑھانے کے بجائے دوسری چیزیں پڑھواتے ہیں اور دینداروں سے دُور رکھتے ہیں کہ مبادا ملّا نہ بن جائے، جب دین اور اہلِ دین سے دور رکھتے ہیں تو سنِ شعور کو پہنچ کر وہ نہ خدا کو پہچانتے ہیں نہ رسول ﷺ کو پہچانتے ہیں، نہ ماں باپ کی کوئی حیثیّت سمجھتے ہیں، ان فیشن کے پرستاروں کے نزدیک ماں باپ کی حیثیّت گھر کے بڑے بُوڑھے ملازم سے بھی کم ہوتی ہے۔ اس میں بہت بڑا قصور ماں باپ کا ہے جنھوں نے اولاد کو فسق و فجور کے راستہ پر ڈالا اور اسلام سے جاہل رکھا۔ اب اولاد بُرا برتاؤ کرتی ہے تو شکایت کیا ہے۔

ع خود کردہ را علاجے نیست

اُمورِ دنیا میں سختی اور دین میں نرمی

بہت سے لوگ دُنیا کے کام اپنے اہل و عیال سے بڑی سختی سے لیتے ہیں۔ سالن میں ذرا نمک کم رہ جائے تو لال پیلے ہو جاتے ہیں کسی بچّے سے ذرا معمولی دُنیا کا کوئی نقصان بھی ہو جائے تو سخت داروگیر کرتے ہیں اور مار پٹائی سے بھی دریغ نہیں کرتے لیکن دینی معاملات میں بالکل ایسے ہو جاتے ہیں جیسے ان کو سانپ سونگھ گیا۔ گویا اُنھیں کچھ پتہ ہی نہیں کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بہت بڑا فریضہ ہے۔ عورتوں کو اور بچّوں کو اور سب ماتحتوں کو فرائض و واجبات سکھائیں اور گناہوں

سے بچائیں نہ حرام کمائیں نہ حرام کھائیں نہ حرام کھلائیں۔

بیاہ شادی وغمی کی بدعات

بیاہ شادی اور غمی کے مواقع میں جو بدعات وخرافات رواج پاگئی ہیں وہ عورتوں کی مستقل شریعت بن گئی ہیں، وہ ان کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتیں۔ مرد بھی ان کی رَو میں بہہ جاتے ہیں اور مولوی صاحب کو یوں سمجھا دیتے ہیں کہ عورتیں نہیں مانتی ہیں اسی طرح بچّوں کے نہ ماننے کا بہانہ کر لیتے ہیں یہ بہانے سب کچھ ہیں اور بے جا ہیں۔ منوانے کی طرح منواؤ گے تو انشاء اللہ تعالیٰ عورتیں بھی مانیں گی اور بچّے بھی مانیں گے، مگر ذرا اپنا مرد پنا تو استعمال کرو۔

بیاہ شادی کے مواقع میں ڈھول اور باجے گاجے بجانا بھی عام ہوگیا ہے۔ اس کے لیے بھی عورتوں اور بچوں کے نہ ماننے کا بہانہ کیا جاتا ہے، حالانکہ گانے بجانے والوں سے خود معاملہ کرکے آتے ہیں اور ان کو اپنی جیب سے پیسے دیتے ہیں۔ جو عمل اپنی خوشی سے اور اپنے پیسے سے کیا ہو، اس کو عورتوں اور بچّوں پر ڈالنا کیسے دُرست ہوسکتا ہے؟

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یُوں کہتے ہیں کہ شادی کے موقعہ پر دف بجانا ثابت ہے! کہاں دف بجانا اور کہاں مروجہ باجے اور گانے؟ شاید ان کو معلوم نہیں کہ دف کیا ہوتا ہے؟ معلوم ہونا چاہیے کہ دف میں صرف ایک جانب کھال وغیرہ مڑھی ہُوئی ہوتی ہے، اور اس میں ہاتھ مارنے سے ڈھب ڈھب کی آواز نکلتی ہے۔ اس آواز میں کوئی کشش نہیں ہوتی ہے اور گانے والے کے نغمات کا ساتھ نہیں دیتی۔ مروجہ ڈھول اور باجوں کو دف پر قیاس کرنا غلط ہے، حدیث شریف میں یُوں وارد ہُوا ہے۔ اَعْلِنُوا هٰذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ وَاضْرِبُوا عَلَيْهِ بِالدُّفُوْفِ[1] یعنی نکاح کا اعلان کرو اور مساجد میں نکاح کیا کرو۔ (کیونکہ وہاں مُسلمان جمع ہوتے ہیں نکاح کا خوب اعلان ہوجائے گا) اور نکاح پر دفوں کو پیٹا کرو، معلوم ہُوا کہ دف پیٹنا نکاح کے اعلان کے لیے ہے مرقات شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ یہ دف پیٹنا مسجد سے باہر ہو۔ اور ایسا دف ہو جس میں بجنے والی

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۷۲

کوئی چیز نہ ہو، پس اس دف سے رواجی ڈھول اور باجوں کو جائز قرار دینا جو فسق و فجور کی دعوت دیتے ہیں اور جو موسیقی کا پورا انداز لیے ہوتے ہیں کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ سراسر فریبِ نفس ہے اور نفس کا دھوکہ ہے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے۔ اَمَرَنِیْ رَبِّیْ بِمحقِ الْمَعَازِفِ وَالْمَزَامِیْرِ وَالْاَوْثَانِ وَالصَّلِیْبِ وَ اَمْرِ الْجَاهِلِیَّةِ[1] یعنی میرے رَبّ نے مجھے حکم فرمایا کہ گانے بجانے کے آلات کو اور بتوں کو اور صلیب کو (جسے عیسائی پوجتے ہیں) اور جاہلیّت کے کاموں کو مٹادوں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کے مٹانے کا حکم دیا، ان چیزوں کو اپنی بیاہ شادی میں خوشی کے ساتھ استعمال کرنا اور پھر اس کو جائز بھی سمجھنا بڑی جہالت ہے۔ بیوی بچّے اپنے گھر کے بڑے کے پابند ہیں۔ نہ کہ بڑا ان سے دَب کر رہے اور ان کو احکام شریعت کے خلاف چلتا دیکھ کر آنکھیں بند کر لے، درحقیقت دین کی اہمیّت اور عظمت دلوں میں نہیں رہی۔ ورنہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ ہی کے رضامندی کے فکرمند ہوتے، بچّوں کے لیے خود گڑیاں اور مورتیاں خرید کر لاتے ہیں خود اُن کے بال انگریزی بنواتے ہیں، پتلون پہننا، ٹائی لگانا سکھاتے ہیں، پھر اُن سے کیا اُمّید ہے کہ آگے جاکر دین پر چلیں گے اور باپ کا کہا مانیں گے۔

خلاصہ یہ کہ ہر شخص اللہ کی رضامندی پر نظر رکھے۔ دوسرا کوئی راضی رہے یا ناراض۔ جس طرح دُنیا کے کاموں میں اپنے ماتحتوں سے نہیں دبتے، بلکہ ان کو دباتے ہیں اسی طرح دینیات کے بارے میں بھی ان کو دبا کر رکھیں اور دین پر چلائیں، ان کی خواہشوں کو دیکھ کر نہ ان کو گناہ کرنے دیں اور نہ خود گنہگار بنیں، حکمت و موعظت کے ساتھ ان کو دین پر لگائیں اور دین پر چلائیں، پیار محبت نرمی سے بھی کام لیں، اور عندالضرورت سختی اور مار پٹائی سے بھی دریغ نہ کریں۔

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۱۸

(قسط:۱)

شخصیات

"فقیہ العراق"

حضرت حمّاد بن ابی سُلیمان کوفیؒ

اُستاذ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ

مولانا نعیم الدّین صاحب، فاضل و مدرس جامعہ مدنیہ

عراق ملکِ عراق اپنی تاریخی و جغرافیائی حیثیّت کے اعتبار سے انتہائی اہم ملک ہے، ایک دَور میں یہ حضرت نوح علیہ السّلام کی دعوت و تبلیغ کا مرکز تھا۔ یہیں جناب ابراہیم علیہ السلام مبعوث ہُوئے۔ جناب یونس علیہ السلام اسی میں فریضۂ رسالت ادا کرتے رہے۔ بابل و نینوٰی اور جبلِ جودی اسی میں واقع ہیں۔

کوفہ اسی ملکِ عراق کا ایک مشہور شہر کوفہ ہے، صحیح روایات کے مطابق یہ شہر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دَورِ خلافت میں آباد کیا تھا، اس شہر کے آباد ہونے کے بعد بڑی تعداد میں جلیل القدر صحابۂ کرام یہاں تشریف لائے۔

علّامہ ابن سعدؒ (م ۲۳۰ھ) فرماتے ہیں۔

"ستّر بدری اور تین سَو بیعت رضوان میں شریک ہونے والے صحابۂ کرام کوفہ میں تشریف فرما ہوئے تھے۔"[1]

حافظ ابوبِشر دولابی حنفیؒ (م ۳۱۰ھ) حضرت قتادہؒ سے جن کا شمار تابعین میں ہے بسند ناقل ہیں۔

"آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہؓ میں سے ایک ہزار پچاس افراد اور چوبیس وہ بزرگ جو غزوۂ بدر میں آپ کے ہمرکاب رہے تھے کوفہ میں

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۶ ص۴

آکر فروکش ہوئے تھے۔"[1]

امام ابوالحسن احمد بن عبداللہ عجلیؒ (م ۲۶۱ھ) فرماتے ہیں کہ

"کوفہ میں ڈیڑھ ہزار صحابۂ کرام آکر اترے۔"[2]

علامہ زاہد الکوثری رحمہ اللہ (م) نے "نصب الرایہ لاحادیث الہدایہ" میں کوفہ کا تعارف کروایا ہے معمولی تصرف کے ساتھ نذرِ قارئین کیا جاتا ہے۔

علامہ موصوف رقمطراز ہیں۔

"فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے عراق کو فتح کیا تو فاروق اعظمؓ نے کوفہ کی تعمیر کا حکم دیا، چنانچہ ۱۷ھ میں کوفہ تعمیر کیا گیا، اس کے اطراف وجوانب میں فصحائے عرب آباد کیے گئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہلِ کوفہ کو قرآن پاک اور مسائلِ دینیہ کی تعلیم کے لیے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو کوفہ بھیجا، آپ نے اہلِ کوفہ کو مخاطب کرکے فرمایا" قد آثر تکم بعبد اللہ علیٰ نفسی" ابن مسعودؓ کی مجھے یہاں ضرورت تھی، لیکن تمہاری ضرورت کو مقدم سمجھتے ہوئے اُن کو بھیج رہا ہوں، اس سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی صحابۂ کرام کے درمیان جو قدر و منزلت ہے وہ ظاہر ہے، کیونکہ اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت عمرؓ جیسی شخصیت بھی آپ کی علمی فقاہت اور بیدار مغزی سے بے نیاز نہیں تھی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، بناءِ کوفہ سے لے کر حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری دور تک اہلِ کوفہ کو قرآن پاک اور مسائلِ فقہیہ کی تعلیم دینے میں مشغول رہے یہاں تک کہ کوفہ قراء اور فقہاءِ محدثین سے بھر گیا، آپ کی اس جدّوجہد اور کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ بقول بعض ثقہ علماء کے اس شہر میں چار ہزار علماء

---

[1] کتاب الکنیٰ والاسماء ج ۱ ص ۱۷۴

[2] فتح القدیر از امام ابن ہمام ج ۱ ص ۹۱ طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

پیدا ہو گئے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ کے ساتھ اس کارِ خیر میں متعدد جلیل القدر صحابۂ کرام مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاص، حذیفہ بن یمان، عمار بن یاسر، سلمان فارسی، ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم بھی شریک رہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ جب کوفہ منتقل ہوئے تو اس شہر کے فقہاء کی کثرت کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا "رَحِمَ اللّٰہُ ابْنَ اُمِّ عَبْدٍ قَدْ مَلَأَ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃَ عِلْمًا" اللہ تعالیٰ ابن مسعود رضؓ کا بھلا کرے اُنھوں نے اس شہر کو علم سے بھر دیا۔ (ابو بکر عتیق بن داود یمانی کا کہنا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ کی وفات کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا کوفہ میں ورود ہُوا یہ وہ زمانہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ وہاں پر لوگوں کو فقیہ بنانے میں مصروف تھے، جناب امیر نے مسجد کوفہ میں آکر دیکھا تو چار سو کے قریب دواتیں رکھی ہُوئی تھیں اور طلباء کتابت علم میں مصروف تھے۔ یہ دیکھ کر آپ نے ارشاد فرمایا " لَقَدْ تَرَکَ ابْنُ اُمِّ عَبْدٍ یَعْنِی ابْنَ مسعودٍ رضی اللہ عنہ ھٰؤُلَاءِ سُرُجَ الْکُوْفَۃِ " بلاشبہہ ابن ام عبد یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو کوفہ کے چراغ بنا کر چھوڑا ہے) باب مدینۃ العلم یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو علم کی طرف توجہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے کسی طرح بھی کم نہیں تھی۔ لہٰذا آپ بھی اہلِ کوفہ کی تعلیم و تربیت میں لگ گئے اور اس طرح کوفہ کا یہ حال ہو گیا کہ فقہاء و محدثین نیز قرّاء و ادباء کی کثرت میں اسلامی شہروں میں سے کوئی شہر بھی کوفہ کے پایہ کا نہ رہا....

ہم یہاں حضرت علی و حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے چند شاگردوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

اسی کوفہ میں عبیدۃ بن قیس سلمانیؒ (م ۷۲ھ) رہتے تھے یہ ایسی ہستی ہیں کہ اگر قاضی شریحؒ جیسی شخصیت کو کسی فیصلے میں دشواری پیش آتی تو باوجود کمالِ علمی کے عبیدہؒ سے مشورہ کرتے تھے۔

اسی شہر میں عمرو بن میمون اَوَدِیؒ (م ۷۴ھ) رہتے تھے آپ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے قدیم شاگردوں میں سے تھے سو مرتبہ حج و عمرہ کی سعادت سے مشرف ہو چکے تھے۔

یہیں ابو عبدالرحمٰن عبداللہ بن حبیب سُلَمِیؒ (م ۷۴ھ) رہتے تھے، آپ نے حضرت عثمان حضرت علی اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے قرأت حاصل کی تھی آپ نے اہلِ کوفہ کو تعلیم قرآن سے بہرہ ور کرنے کے لیے اپنے آپ کو دنیوی کاموں سے فارغ کر لیا تھا اور مسلسل چالیس سال تک جامع مسجد کوفہ میں تعلیم قرآن دیتے رہے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دونوں صاحبزادوں حسن و حسین رضی اللہ عنہما نے آپ ہی سے قرأت سیکھی تھی۔

اسی شہر کوفہ میں سوید بن غفلہؒ (م ۸۲ھ) رہتے تھے، آپ عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم کی زیارت سے مشرف تھے۔

حضرت علقمہ بن قیسؒ (م ۶۲ھ) کا قیام بھی اسی شہر میں تھا، آپ حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت ابو الدرداء، حضرت عمر حضرت زید اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ آپ کے بارے میں فرماتے ہیں" جس چیز کا مجھے علم ہے اس چیز کا علقمہ کو بھی علم ہے۔ محدث رامہرمزی نے اپنی کتاب "المحدث الفاصل" میں قابوس بن ظبیان سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نے اپنے والد سے دریافت کیا کہ یہ کیا بات ہے کہ آپ اصحاب رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کو چھوڑ کر علقمہ کے پاس جایا کرتے ہیں؟ فرمایا جان پدر میں خود اُن کے پاس جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہ کو مسائل دریافت کرنے کے لیے آتے جاتے دیکھتا ہوں۔

یہیں مسروق بن الاجدعؒ (م ۶۳ھ) کا قیام تھا۔

اسی شہر میں اسود بن یزیدؒ (م ۷۴ھ) رہتے تھے، آپ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ، حضرت علی حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابو موسیٰ اشعری حضرت حذیفہ بن یمان، حضرت بلال بن رباح، حضرت

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم جیسے کبار صحابۂ کرام کے شاگرد تھے، اسّی مرتبہ حج وعمرہ کی سعادت سے مشرف ہوتے تھے۔

قاضی شریحؒ (م ۸۰ھ) یہاں کے مشہور قاضی رہ چکے ہیں، آپ دورِ فاروقی میں عہدۂ قضاء پر فائز ہوتے ہیں اور حجاج بن یوسف کے زمانے تک مسلسل ۶۲ برس قاضی رہے ہیں، آپ ہی وہ شخصیت ہیں جن کے بارے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے تھے قُمْ یَا شُرَیْحُ فَاَنْتَ اَقْضَی الْعَرَبِ۔ شریح اُٹھو اور فیصلہ کرو کیونکہ تم عرب میں سب سے بڑھ کر قاضی ہو۔

اسی شہر میں عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ (م ۸۳ھ) رہا کرتے تھے، آپ ایک سو بیس صحابۂ کرام کی زیارت سے مشرف تھے۔

سعید بن جبیرؓ (م ۹۵ھ) یہاں ایسے تھے کہ جب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کوفہ کا کوئی آدمی مسئلہ دریافت کرتا تو فرماتے "کیا تمہارے یہاں سعید بن جبیرؓ نہ تھے جو یہاں دریافت کرنے آئے"۔

اسی کوفہ کے رہنے والے حضرت ابراہیم بن یزید نخعیؒ (م ۹۵ھ) بھی تھے آپ حضرت عائشہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما کی زیارت سے مشرف تھے، اپنے بچپن میں حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، (اگر کوئی حضرت سعید بن جبیرؓ سے مسئلہ پوچھتا تو فرماتے تم مجھ سے مسئلہ پوچھتے ہو، حالانکہ ابراہیم نخعی جیسے صاحب علم تم میں موجود ہیں)

اسی کوفہ میں مشہور تابعی امام شعبیؒ رہتے تھے (آپ پانچ سو صحابۂ کرام کی زیارت سے مشرف تھے) آپ جب مغازی بیان کر رہے ہوتے تو آپ کو دیکھ کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے "باوجودیکہ ہم غزوات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے، لیکن ان مغازی کی یادداشت جتنی ان کو ہے ہم کو نہیں"۔

اس دَور کے بعد ان حضرات کے شاگردوں کا زمانہ آتا ہے۔ ان کی تعداد بھی ہزاروں سے متجاوز تھی، ابوبکر جصاصؒ کہتے ہیں کہ "دیرِ جماجم" میں حجاج سے جنگ

القدر
کرنے کے لیے تنہا عبدالرحمٰن بن الاشعث کے ساتھ چار ہزار کی تعداد میں جلیل قرّاء و فقہاء تابعین تھے... ابو محمد رامہرمزی "المحدث الفاصل" میں علّامہ ابن سیرین رح سے روایت کرتے ہیں کہ جب میں کوفہ پہنچا تو اس وقت وہاں چار ہزار محدّثین اور چار سو فقہاء موجود تھے۔ عفان بن مسلم رح (امام بخاری رح کے استاذ) سے روایت ہے کہ جب ہم کوفہ پہنچے تو وہاں ہم نے چار ماہ قیام کیا، حدیث کا وہاں اس قدر چرچا تھا کہ اگر ہم حدیثیں لکھنا چاہتے تو ایک لاکھ حدیثیں لکھ سکتے تھے، لیکن ہم نے صرف پچاس ہزار پر اکتفاء کیا۔ پھر کسی سے املاء کے علاوہ راضی نہیں ہوتے سوائے شریک رح کے کہ انھوں نے ہم سے انکار کر دیا، اور ہم نے کوفہ میں کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا کہ جو عربیت میں غلطی کرے اور اس کو روا رکھے"[1]

- قراء سبعہ میں سے تین قاری، عاصم حمزہ اور کسائی تینوں کوفی ہیں۔
- فن حدیث کی تبویب سب سے پہلے کوفہ میں ہوئی، صحیح احادیث کا مجموعہ بھی سب سے پہلے یہیں مرتب ہوا۔
- عربیت اور نحو کی تدوین بھی بصرہ کے ساتھ کوفہ میں ہوئی۔
- فقہ کے متعلق تو پوچھنا ہی کیا امام ابو حنیفہ رح نے اس کو "معدن العلم والفقہ" کا لقب دیا ہے[2]

سفیان بن عیینہ رح فرمایا کرتے تھے

"من اراد المغازی فالمدینة ومن اراد المناسك فمكة ومن اراد الفقه فالكوفة"[3]

---

[1] مقدمہ نصب الرایہ ج ۱ ص ۲۹ تا ۳۵

[2] مناقب ابی حنیفہ للامام الموفق ابن احمد مکی ص ۵۲

[3] مناقب ابی حنیفہ رح

مغازی کے لیے مدینہ طیبہ، مناسک کے لیے مکّہ مکرّمہ اور فقہ کے لیے کوفہ ہے۔

○ فقہ حنفی جس پر بارہ سو برس سے اسلامی دُنیا کا تقریباً دو ثلث حصّہ عمل پیرا چلا آتا ہے اس کی بُنیاد بھی یہیں پڑی۔

○ علّامہ نووی شافعیؒ (م ۶۷۶ھ) اسے "دار الفضل و محل الفضلاء"[1] فضیلت کا گھر اور فضلاء کا محل قرار دیتے ہیں۔

○ صاحبِ قاموس علّامہ مجد الدّین فروز آبادیؒ اسے "قبۃ الاسلام و دار ہجرۃ المسلمین"[2] اسلام کا قبہ اور مسلمانوں کی جائے ہجرت لکھتے ہیں۔

○ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے اس شہر کو اپنا دار الخلافہ قرار دیا، چار سال تک آپ کا یہاں قیام رہا اور آپ کے بیشتر فیصلے یہیں صادر ہوئے۔

○ حضرت امام بخاریؒ (م ۲۵۶ھ) نے طلبِ حدیث میں بخارا سے لے کر مصر تک تمام اسلامی شہروں کا سفر کیا تھا، دو دفعہ جزیرہ گئے، چار دفعہ بصرہ جانا ہوا، چھ سال تک حجاز میں مقیم رہے، مگر اس کے باوجود کوفہ اور بغداد کی وہ اہمیّت تھی کہ فرماتے ہیں۔

○ "لَا اُحْصِیْ کَمْ دَخَلْتُ اِلَی الْکُوْفَۃِ وَ بَغْدَادَ مَعَ الْمُحَدِّثِیْنَ"[3] میں شمار بھی نہیں کر سکتا کہ کوفہ اور بغداد میں مجھے محدّثین کے ساتھ کتنی بار جانا پڑا۔

اس مرکزِ اسلام میں ——— جو صدیوں تک علومِ اسلامیہ کا دار العلوم بنا رہا اور جو عہدِ مرتضوی سے لے کر بغداد کے تعمیر ہونے تک وسعتِ علم اور کثرتِ حدیث میں تمام بلادِ اسلامیہ میں ممتاز رہا ——— ایک بہت بڑے محدّث و فقیہ گزرے ہیں جن کا نام نامی حمّاد ہے، آپ مشہور تابعی ہیں، حضرت

---

[1] شرح مسلم للنووی ج ۱ ص ۱۸۵

[2] القاموس المحیط ج ۳ ص ۱۹۹

[3] ھَدْیُ السّاری مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۲۵۰

انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، اپنے زمانے میں کوفہ کے رؤساءِ عظام اور فقہاءِ بے مثل میں شمار ہوتے تھے۔

اُوپر جو شہر کوفہ کی خصوصیات اور اس کے امتیازات ذکر کیے گئے ہیں وہ درحقیقت حضرت حمادؒ کے تذکرے کی تمہید کے طور پر ذکر کیے گئے ہیں، کیونکہ حضرت حمادؒ کوفہ کے رہنے والے تھے، ہمارا ارادہ ہے کہ آپ کے حالات جو کتبِ "اسماء الرجال" میں بکھرے ہوئے ہیں اُنھیں یکجا کر کے نذرِ قارئین کیا جائے۔ لہٰذا اب آپ امام حمادؒ کے تفصیلی حالات ملاحظہ فرمائیں۔

نام و نسب

آپ کا نام حماد ہے، والد کا نام مسلم ہے، مسلم اپنے نام سے زیادہ اپنی کنیت ابوسلیمان سے مشہور ہیں، سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔

"حماد بن مسلم بن یزید بن عمرو"

آپ کے آباؤ اجداد اصفہان کے شمالی علاقے بُرخُوار کے رہنے والے تھے

ابوالشیخ انصاری (م ۳۶۹ھ) تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو فارس، اصطخر اور اصفہان وغیرہ کی مہم پر روانہ فرمایا، چنانچہ آپ نے یہ علاقے فتح کر لیے، مسلم بن یزید (حضرت حماد کے والد) آپ کے پاس چلے آئے اور آپ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کر لیا، آپ اصفہان کے بادشاہ اور منتظم الامور کے صاحبزادے تھے، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ آپ کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لے آئے۔ مسلم بن یزید نے آپ کے سامنے اپنے اسلام کا اعادہ کیا، آپ نے مسلم بن یزید کو کوفہ میں ایک خطہ الاٹ کر دیا۔ وہ خطہ آج تک آپ کی اولاد کے پاس باقی چلا آرہا ہے"[1]

---

[1] طبقات المحدثین باصبہان ج ۱ ص ۳۲۷

ابو نُعیم اصفہانی (م ۴۳۰ھ) کا کہنا ہے کہ

"حماد اصفہان کے علاقے بُرْخُوَارْ سے قید کر کے کوفہ لائے گئے تھے، آپ کے والد نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کیا تھا۔

حماد: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ابراہیم کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) تھے، اور حماد کے والد ابو سلیمان ان دس غلاموں میں سے تھے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو ہدیے میں دیے تھے۔"[1]

یہ دونوں باتیں بظاہر متضاد نظر آتی ہیں ان میں سے کون سی صحیح ہے کون سی غلط ہے اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ امام حمادؒ کے جو اوصاف و کمالات کتابوں میں مذکور ہیں اُن سے ابو شیخ انصاری کی بات راجح معلوم ہوتی ہے، لیکن اکثر مؤرخین نے دوسری بات ہی ذکر کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک ابو نُعیم کی بات راجح ہے تاہم اس سے امام حمادؒ کی جلالتِ قدر میں کسی قسم کی کمی نہیں آتی، کیونکہ اس زمانے پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے بڑے بڑے نامور محدّث و فقیہ مَوَالِی (آزاد شدہ غلام) تھے، اس موقع پر ایک واقعہ یاد آیا جو علّامہ ابن عبدربہ (م) نے اپنی کتاب "العقد الفرید" میں لکھا ہے قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کیا جاتا ہے، گو کہ اس واقعہ سے ابو نُعیم کی بات کو ترجیح معلوم ہوتی ہے، علّامہ ابن عبدربہ اپنی مشہور کتاب "العقد الفرید" میں رقم طراز ہیں۔

"ابن ابی لیلیٰ نے ذکر کیا کہ ایک مرتبہ عیسیٰ بن موسیٰ نے اُن سے دریافت کیا فقیہہ لوگ کون تھے؟ یہ عیسیٰ بڑے متعصب مذہبی آدمی تھے میں نے جواباً کہا حسن بن ابی الحسن اُس نے کہا اور کون؟ مَیں نے کہا، محمد بن سیرینؒ اس نے کہا دونوں کی کیا حیثیّت تھی؟ مَیں نے کہا موالی (آزاد کردہ غلام) وہ بولے، فقیہہ مکہ کون تھے؟ مَیں

---

[1] تاریخ اصفہان ج ۱ ص ۲۸۸

نے کہا: عطاء بن ابی رباح رح، مجاہد رح، سعید بن جبیر رح اور سلیمان بن یسار رح اس نے کہا وہ کون تھے؟ مَیں نے کہا: موالی، وہ بولا، فقہاء مدینہ کون تھے؟ مَیں نے کہا: زید بن اسلم رح، محمد بن المنکدر رح اور نافع بن ابی نجیح۔ بولا یہ کن دیار و اَمصار کے باشندے ہَیں؟ مَیں نے کہا۔ مَوالی! وہ غصّہ سے سُرخ ہوگیا۔ پھر پوچھا، اہلِ قباء میں سب سے بڑا فقیہہ کون تھا؟ مَیں نے کہا: ربیعہ رائے رح اور ابن ابی الزِناد رح اس نے دریافت کیا۔ وہ کون تھے؟ مَیں نے کہا: موالی۔ اس کا چہرہ متغیّر ہوگیا۔ پھر پُوچھا، فقیہہ یمن کون تھے؟ مَیں نے کہا طاؤس رح اُن کے صاحبزادے اور ابن منبّہ رح، پُوچھا وہ کون تھے؟ میں نے کہا، موالی، اس کی رگیں پھُول گئیں، اور تن کر کھڑا ہوگیا۔ پھر پُوچھا، فقیہہِ خراسان کون تھے؟ مَیں نے کہا عطاء بن عبداللہ خراسانی رح، پُوچھا عطاء۔ کون تھے؟ مَیں نے جواب دیا وہ مولیٰ تھے۔ اس کے چہرے کا مٹیالا پن اور بڑھ گیا اور اس پر ایسی سیاہی چھا گئی کہ مَیں ڈر گیا پھر پُوچھا: فقیہہِ شام کون تھے؟ مَیں نے کہا مکحول رح، بولا مکحول کون تھے؟ مَیں نے کہا مولیٰ۔ اُس نے سَرد آہ بھری اور کہا: فقیہہِ کوفہ کون تھے؟ بخدا، اگر میں اس سے خائف نہ ہوگیا ہوتا تو کہتا حکم بن عُتیبہ رح اور حمّاد بن ابی سلیمان رح (یہ بھی موالی تھے) مگر مجھے اُس میں شر کے آثار نظر آئے اور مَیں نے کہا: ابراہیم نخعی رح اور شعبی رح اس نے کہا وہ کون تھے؟ مَیں نے کہا عربی۔ اُس نے بے ساختہ نعرہ تکبیر لگایا اور اُسے اطمینان کا سانس نصیب ہُوا۔"[1]

لگے ہاتھ اسی قسم کا ایک اور واقعہ بھی ملاحظہ فرماتے چلیں یہ واقعہ حضرت عطاء بن عبداللہ خراسانی رح اور ہشام بن عبدالملک اُمَوی کے درمیان پیش آیا تھا

حضرت عطاء فرماتے ہَیں میں رصافہ میں ہشام بن عبدالملک سے ملا۔ ہشام نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا آپ کو مختلف شہروں کے علماء کا کچھ حال معلوم ہے

---

[1] العقد الفرید ج ۳ ص ۴۱۵

مَیں نے کہا، کیوں نہیں ـــــ پُوچھا اہلِ مدینہ کے فقیہہ کون ہَیں ؟ مَیں نے کہا، نافع مولیٰ ابن عمرؓ۔ بولا، اہل مکّہ کے فقیہہ کون ہَیں ؟ مَیں نے کہا، عطاء بن ابی رباحؒ۔ اس نے پُوچھا کہ وہ عربی ہیں یا مولیٰ (عجمی) ؟ مَیں نے کہا مولیٰ۔ پھر دریافت کیا۔ اہل یمن کے فقیہہ کون ہَیں ؟ مَیں نے کہا طاؤس بن کیسانؒ، پُوچھا مولیٰ ہَیں یا عربی۔ مَیں نے کہا مولیٰ۔ پوچھا اہلِ یمامہ کے فقیہہ کون ہَیں ؟ مَیں نے کہا یحییٰ بن کثیرؒ پوچھا مولیٰ ہیں یا عربی۔ مَیں نے کہا مولیٰ۔ بولا، اہل شام کے فقیہہ کون ہیں ؟ مَیں نے جواباً کہا مکحولؒ۔ پُوچھا مولیٰ ہَیں یا عربی۔ میں نے کہا مولیٰ۔ کہنے لگا اہل جزیرہ کے فقیہہ کون ہَیں ؟ مَیں نے کہا میمون بن مہرانؒ، بولا مولیٰ ہَیں یا عربی۔ مَیں نے کہا مولیٰ۔ پُوچھا اہل خراسان کے فقیہہ کون ہَیں ؟ مَیں نے کہا ضحاک بن مزاحمؒ۔ پُوچھا مولیٰ ہیں یا عربی مَیں نے کہا مولیٰ پُوچھا اہلِ بصرہ کے فقیہہ کون ہَیں ؟ مَیں نے کہا حسنؒ اور ابن سیرینؒ۔ کہا وہ دونوں مولی ہیں یا عربی مَیں نے کہا مولیٰ ہَیں۔ دریافت کیا اہلِ کوفہ کے فقیہہ کون ہَیں ؟ مَیں نے کہا ابراہیم نخعیؒ، پُوچھا مولیٰ ہَیں یا عربی، مَیں نے کہا عربی۔ ہشام کہنے لگا میرا خیال تھا کہ میری جان نکل جائے گی، اور کسی عربی کا نام تمہاری زبان پر نہیں آئے گا۔"[1]

اساتذۂ کرام

امام حمادؒ کے اساتذہ میں سرِفہرست حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہَیں، ان کے علاوہ آپ نے بڑے بڑے جلیل القدر تابعین سے فیض پایا ہے جن کے اسماء گرامی درج ذیل ہَیں۔

۱۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۱۰ھ) علّامہ ذہبیؒ فرماتے ہَیں "آپ علم کا سمندر، فقیہ النفس، کبیر الشان عدیم النظیر اور بلیغ التذکیر تھے۔"[2]

---

[1] مناقب ابی حنیفہ للامام الموفقؒ ص ۱۲۔

[2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۲

۲۔ حضرت زید بن وہب جہنی رحمہ اللہ (م قریب ۸۴ھ) آپ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت ابوذر اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہم کے شاگردِ رشید تھے۔

۳۔ حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ (م ۹۵ھ) آپ حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عدی بن حاتم، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہم کے شاگرد تھے، ظالم حجاج نے آپ کو شہید کیا تھا۔

۴۔ حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ (م ۹۴ھ) آپ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد خاص اور آپ کے داماد تھے۔ امام ذہبیؒ آپ کو "شیخ الاسلام" لکھتے ہیں۔ علی بن مدینیؒ کا کہنا ہے کہ میں تابعین میں آپ سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں جانتا۔[1]

۵۔ حضرت ابووائل شقیق بن سلمہ رحمہ اللہ (م ۸۲ھ) آپ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں، صرف دو مہینے میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔

۶۔ حضرت عامر بن شراحیل شعبی رحمہ اللہ (م ۱۰۳ھ) آپ پانچ سو صحابۂ کرام کی زیارت سے مشرف اور جلیل القدر صحابۂ کرام کے شاگرد تھے۔ دورِ صحابہ میں فتویٰ دیا کرتے تھے، امام ذہبیؒ آپ کو "علامۃ التابعین" تحریر فرماتے ہیں۔[2]

۷۔ حضرت عبداللہ بن بریدۃ رحمہ اللہ (م ۱۱۵ھ) اپنے والد حضرت بریدہ حضرت عائشہ حضرت سمرہ بن جندب، حضرت عمران بن حصین، حضرت ابوموسیٰ اشعری حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی ہے آپ مرو کے قاضی اور خراسان کے عالم تھے۔

۸۔ عبدالرحمٰن بن سعد: مولیٰ آلِ عمرؓ رم

۹۔ عکرمہ: مولیٰ ابن عباس رضی اللہ عنہم، (م ۱۰۷ھ) آپ حضرت علی حضرت عبداللہ بن عباس،

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، ج ۱ ص ۵۴

[2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۹

حضرت عائشہ، حضرت ابوہریرہ حضرت عقبہ بن عامر حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم سے روا
کرتے ہیں، حضرت سعید بن جبیرؒ سے سوال ہُوا کہ آپ اپنے سے بڑا عالم جانتے ہیں فرمایا ہا
عکرمہ ہیں۔ قرہ بن خالد کہتے ہیں کہ عکرمہ بصرہ تشریف لاتے تو خواجہ حسن بصریؒ تفسیر بیا
کرنے سے رُک جاتے تھے۔[1]

۱۰۔ حضرت ابراہیم بن یزید نخعی رحمۃ اللہ علیہ (م ۹۵ھ) آپ نے حضرت عائشہ اور حضرت ابوس
خدری رضی اللہ عنہما کی زیارت کی ہے۔ بچپن میں آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت
میں حاضر ہُوئے تھے۔ امام شعبیؒ نے آپ کی وفات کے بعد فرمایا کہ ابراہیم نے اپنے سے بڑا ع
اور فقیہ کوئی نہیں چھوڑا، لوگوں نے کہا کہ کیا حسن بصری اور ابن سیرین بھی نہیں؟ تو امام شعبی
نے فرمایا کہ نہ صرف حسن بصری اور ابن سیرین بلکہ اہلِ بصرہ، کوفہ، حجاز اور شام میں بھی کوئی نہیں
حضرت حمادؒ کے اساتذہ کی یہ فہرست علّامہ مزّی (م ۷۴۲ھ) نے "تہذیب الکمال"[2] میں دی ہے
اس فہرست سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس شخصیّت کے اساتذہ اس پائے کے ہوں اس کے
علم و عرفان کا کیا حال ہوگا۔ حضرت حمادؒ نے اپنے اساتذہ میں سے سب سے زیادہ استفادہ
حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے کیا ہے، جب تک وہ زندہ رہے۔ حضرت حمادؒ اُن سے استفادہ
کرتے رہے۔

ابوالشیخ انصاریؒ نے آپ کے زمانۂ طالب علمی کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے، ملاحظہ فرمائیے۔

"ایک دن حضرت ابراہیم نخعیؒ نے حمادؒ کو ایک درہم کا گوشت لانے کے لیے بازار بھیجا، زنبیل ان کے ہاتھ میں تھی، اُدھر سے کہیں اُن کے والد گھوڑے پر سوار آ رہے تھے۔ یہ صُورت دیکھ کر اُنھوں نے حماد کو ڈانٹا اور زنبیل لے کر ہاتھ سے پھینک دی۔ جب حضرت ابراہیم نخعیؒ کی وفات ہوگئی تو حدیث کے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۶

[2] تہذیب الاسماء و اللغات ج ۱ ص ۱۰۴ للامام النوویؒ

[3] ج ۷ ص ۲۷۰

طلبہ اُن کے والد (مسلم بن یزید، ابوسلیمان) کے دروازے پر آئے اور دستک دی یہ چراغ لے کر باہر نکلے تو اُن طلبہ نے کہا ہمیں آپ کی ضرورت نہیں آپ کے فرزند حمادؒ کی ضرورت ہے۔ یہ خفیف ہو کر اندر تشریف لے آئے اور حمادؒ سے کہا جاؤ بھئی باہر جاؤ۔ اب مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ مقام تمہیں ابراہیم کی زنبیل کی بدولت ہی نصیب ہوا ہے۔"[1]

استاذ کی خدمت کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو علمِ شریعت اور فقاہت فی الدین سے نوازا اور آپ حضرت ابراہیم نخعیؒ کے تلامذہ میں سب سے بڑے فقیہ شمار ہونے لگے۔

چنانچہ علامہ ذہبیؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"وھو انبلُ اصحابہ وافقھھم واقیسُھم وابصرُھم بالمناظرۃ والرأی"[2]

آپ حضرت ابراہیمؒ کے تلامذہ میں سب سے زیادہ ذکی و ذہین سب سے بڑے فقیہ، سب سے زیادہ قیاس کرنے والے اور مناظرے اور رائے میں سب سے زیادہ بصیرت و مہارت رکھنے والے تھے۔

حضرت ابراہیم نخعیؒ کی صحبت سے آپ کی علمی استعداد اور صلاحیت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ آپ اُن کی زندگی ہی میں فتوے دینے لگے تھے۔ چنانچہ حضرت حمادؒ کے ایک ہم سبق حضرت مُغیرہ بن مِقسَمؒ کو آپ کے فتوے دینے پر تعجب ہوا تو اپنے استاذ حضرت ابراہیم نخعیؒ سے عرض کیا "ان حمادًا قد قعد یفتی" کہ حمادؒ تو فتوے دینے لگے، استاذ مکرم حضرت ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا:

"ومایمنعہ ان یفتی وقد سألنی

اس میں تعجب کی کیا بات ہے، آخر اُنھیں فتوے دینے سے کون سی چیز مانع ہے؟ حماد نے تن تنہا

---

[1] طبقات المحدثین ج ۱ ص ۳۳۰

[2] سیر اعلام النبلاء ج ۵ ص ۲۳۱

هو وحده عـالم تسألوني كلكم عن عشره"[1]

مجھ سے اس قدر مسائل دریافت کیے ہیں کہ تم سب نے مل کر بھی اُن کے دسویں حصّے کے برابر بھی مسائل دریافت نہیں کیے۔

حضرت ابراہیم نخعی رح کو اپنے لائق شاگرد کی علمی قابلیت پر حد درجے اعتماد تھا اور آپ لوگوں کو اُن سے علم حاصل کرنے کا حکم دیتے تھے، چنانچہ وہی مُغیرہ بن مقسم رح فرماتے ہیں۔

جن دنوں آپ حجاج بن یوسف کی ایذاء رسانی کی وجہ سے روپوش تھے ہم آپ کے پاس آپ کی عبادت کے لیے حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا "علیکم بحماد فانه قد سألني عن جميع ما سألني عنه الناس" تحصیلِ علم کے لیے حماد کو لازم پکڑ لو، کیونکہ مجھ سے وہ تمام ایسے مسائل دریافت کر چکے ہیں جن کے متعلّق لوگ مجھ سے استفسار کیا کرتے تھے۔[2]

ابن ادریس فرماتے ہیں کہ ہمیں ابو اسحاق شیبانی نے عبد الملک بن ایاس شیبانی سے نقل کیا کہ انھوں نے حضرت ابراہیم نخعی رح سے دریافت کیا کہ ہم آپ کے بعد کس سے مسائل دریافت کریں؟ آپ نے فرمایا حماد رح سے، ابن ادریس کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ جب بھی ابو اسحاق شیبانی امام حماد رح کا تذکرہ کرتے تو خُوب ان کی تعریف کرتے۔"[3]

انتقالِ پُر ملال

گزشتہ ماہ جامعہ کے مخلص و بہی خواہ جناب شاہد اشرف صاحب کی دادی محترمہ طویل علالت کے بعد وفات پاگئیں اِنّا للہ وَاِنّا الیہ راجعون مرحومہ بہت عبادت گزار اور سادہ خاتُون تھیں دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنّت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے آمین۔

---

[1] تہذیب الکمال ج ۷، ص۲۷۴ [2] سیر اعلام النبلاء ج ۵ ص ۲۳۲

[3] سیر اعلام النبلاء ج ۵ ص ۲۳۲

مضامینِ علمیہ

قسط: ۱۰

تحفۂ اصلاحی

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب فاضل و مدرس جامعہ مدنیہ

امین احسن اصلاحی صاحب نے اپنی تفسیر "تدبر القرآن" کے علاوہ اُصولِ تفسیر میں "مبادی تدبّر قرآن" اور اُصولِ حدیث میں "مبادی تدبّرِ حدیث" بھی لکھی ہیں۔ اصلاحی صاحب کے مبادی اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ ع

ہُوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

اپنے سلسلہ مبادی میں اُنہوں نے جو گل افشانیاں کی ہیں وہ مدلّل البطلان اور احقاق حق کے ساتھ ہدیۂ قارئین ہیں۔ دُعا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اصلاحِ احوال کا ذریعہ بنائے آمین

قال الحافظ ابن حجر رحمہ اللہ فی مقدمۃ الفتح

فالارجاء بمعنی التاخیر و ھو عندھم علی قسمین

ارجاء جو کہ تاخیر کے معنی میں ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔

منھم من ارادبہ تاخیر القول فی الحکم فی تصویب احدی الطائفتین اللتین تقاتلوا بعد عثمان

بعض نے تو اس سے مراد لیا ان دو فریقوں میں سے کسی ایک کی تصویب کا حکم لگانے سے تاخیر کرنا جنہوں نے حضرت عثمان کے بعد باہم قتال کیا۔

ومنھم من اراد : تاخیر القول فی الحکم علی من اتی الکبائر و ترک

بعض نے اس سے یہ مراد لیا کہ جس شخص نے کبائر اور ترک فرائض کا ارتکاب کیا ہو اس سے جہنم میں داخلہ کے حکم کے

الفرائض بالنار لان الایمان عندهم الاقرار والاعتقاد ولا یضر العمل مع ذلك"

قول سے تاخیر کرنا کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک ایمان فقط اقرار و اعتقاد کا نام ہے اور اس کے ہوتے ہوئے عمل ضرر نہیں کرتا۔

قلت: ولا یخفی ان الارجاء بالمعنی الاوّل لیس من الضلالة فی شئ بل هو - والله - الورع والاحتیاط والسکوت عما جری فی الصحابة وشجر بینهم أولی - فلیس کل من اطلق علیه الإرجاء متهما فی دینه وخارجا عن السنة بل لا بدمن الفحص عن حاله - فان کان لارجائه امر الصحابة - الذین تقاتلوا فیما بینهم - الی الله وتوقفه عن تصویب احدی الطائفتین فهو من اهل السنة ومن حزب الورعین حتما۔

یہ بات مخفی نہیں ہے کہ ارجاء بمعنی اوّل میں کسی بھی قسم کی گمراہی نہیں ہے بلکہ وہ تو حقیقت میں احتیاط اور پرہیز ہے اور مشاجرات صحابہ کے بارے میں سکوت اولی ہے۔ لہٰذا ہر وہ شخص جس پر ارجاء کا لفظ بولا گیا ہے، وہ سُنّت سے خارج اور دین میں متہم نہیں ہے بلکہ اس کی حالت کی تفتیش ضروری ہے۔ اگر اس کی وجہ باہم قتال کرنے والے صحابہ کے معاملہ کو اللہ کی طرف تاخیر کرنا ہے۔ اور کسی ایک جماعت کی تصویب کرنے سے توقف کرنا ہے تو وہ قطعی طور پر اہلِ سُنّت اور محتاط لوگوں کی جماعت میں سے ہے۔

ومن اطلق علیه ذلك لقوله بعدم اضرار المعاصی فهو الذی یتهم فی دینه

اور جس شخص پر اس کا اطلاق اس بناء پر ہوا کہ وہ معاصی کے نقصان دہ نہ ہونے کا قائل ہو تو یہی وہ شخص ہے جو اپنے دین میں متہم ہے۔

قال الآمدی: ان المعتزلة کانوا فی الصدر الاوّل یسمون من خالفهم فی القدر مرجئا اولانه لما قال الایمان لا یزید ولا ینقص ظن به الارجاء بتاخیر

آمدی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ صدرِ اوّل میں معتزلہ اپنے مخالفین کو مرجئی کہتے تھے جب کوئی شخص کہتا ہے کہ ایمان نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے تو اس کے بارے میں ارجاء

العمل من الایمان۔

قلت واطلاق الارجاء من المحدثین علی من لا یقول بزیادۃ الایمان و نقصانہ ولا بدخول العمل فی حقیقتہ کثیر و ھو لیس بطعن فی الحقیقۃ علی ما یخفی علی مھرۃ الشریعۃ فان النزاع فی ذلک لفظی۔

بمعنی ایمان سے عمل کی تاخیر کا گمان کیا جاتا تھا

محدثین کا ایسے شخص پر جو ایمان کے بڑھنے اور کم ہونے کا اور عمل کے ایمان کی حقیقت میں داخل ہونے کا قول نہ کرتا ہو ارجاء کا اطلاق کثیر ہے، حالانکہ جیسا کہ شریعت کے ماہرین پر مخفی نہیں ہے۔ حقیقت میں کوئی طعن نہیں ہے، کیونکہ اس بارے میں نزاع لفظی ہے۔

قواعد فی علوم الحدیث ص۱۴۱ تا ص۱۴۳)

ہماری ان گزارشات سے یہ واضح ہوگیا کہ جن راویوں پر بدعتی ہونے کا الزام ہے ان میں سے عام طور سے تو وہ ہیں جن کی بدعت ایسی نہیں کہ عقل یا شرع کی رو سے ان کی روایت قبول کیے جانے سے مانع ہو۔

اور جو بعض روایتیں بڑی بدعات والوں سے لی گئی ہیں تو اس کی حقیقت کو ایک مثال سے سمجھیے۔ ہمارے دور میں جماعت اسلامی ایک جماعت ہے جس کے افراد نے مودودی صاحب کے افکار و نظریات کو اختیار کیا ہے۔ اور مودودی صاحب اپنی تفسیر بالرائے اور انبیاء علیہم السلام اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں اپنے طرزِ فکر کے اعتبار سے اہلِ سنّت کے مخالف اور بدعتی ہیں، لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ وہ نماز روزے کے مسائل میں اہلِ سنّت کے موافق ہیں اور ان کے نزدیک ان مسائل و احکامات کی ان کے نزدیک وہی اہمیت ہے جو اہلِ سنّت کے نزدیک ہے۔ اب اس جماعت کا کوئی شخص جس کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا گناہوں سے بچتا ہے اور اچھے حافظہ کا مالک ہے شخص جب کسی معتبر عالم سے سنا ہوا نماز روزہ سے متعلق کوئی مسئلہ بیان کرے تو کیا یہ بات معقول ہوگی کہ ہم اس شخص کی روایت کو محض اس وجہ سے رد کر دیں کہ وہ مودودی صاحب کے سے افکار کا حامل ہے کوئی اگر احتیاط کو اختیار کرے اور جماعت اسلامی کے اس شخص کی روایت کو قبول نہ کرے تو احتیاط بھی ایک وجہ بن سکتی ہے لیکن جو لوگ اس شخص کی روایت کو قبول

کرتے ہوں ان کا طرزِ عمل بھی عقل اور شرع کے عین مطابق ہے۔ علاوہ ازیں اس طرزِ عمل میں دوسرے پہلو سے احتیاط ہے اور وہ اس طرح کہ ہو سکتا ہے کہ اس مسئلہ کو جاننے کا اس وقت اور اس مقام میں صرف وہی ایک ذریعہ ہو یا اگر ذرائع بھی ہوں تو اس کی روایت سے تائید تو حاصل ہو گی۔

رہا یہ خیال کہ مبتدع سے روایت لینے میں اس کی بدعت اور اس کے فتنہ کی ترویج و اعانت ہے تو یہ کوئی ضروری نہیں۔ کیونکہ اس راوی کے بدعتی عقیدہ کو بھی جب بیان کر دیا گیا تو گویا وضاحت کر دی گئی کہ اس کے عقیدہ اور بدعت سے اجتناب ضروری ہے۔

ایسے ہی ان مبتدعین کا معاملہ سمجھیں جن سے ائمہ مجتہدین حدیث لینے کو جائز کہتے ہیں۔

ہمارے اس وضاحت سے وہ تمام غلط فہمیاں اور بدگمانیاں ختم ہو جاتی ہیں جن کو امین احسن اصلاحی صاحب پیدا کر کے لوگوں کو حدیث اور ائمہ حدیث سے بدظن کرنا چاہتے ہیں اور ثابت ہوا کہ ائمہ مجتہدین اپنے زمانے کے حالات اور افکار سے بخوبی واقف تھے اور صحابہ کرام اور کبار تابعین کی صحبت میں رہنے کی بناء پر اُن کو دین کی حفاظت کی ہم سے زیادہ فکر تھی اور حفاظت کے شرعی طریقوں سے بھی وہ ہم سے زیادہ باخبر تھے۔

بقیہ: سیرت مبارکہ

۲۔ جن لوگوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کی یا اب تک کوئی معاہدہ ہی نہیں کیا تھا ان کو چار[1] ماہ کی مہلت اور دی جاتی ہے۔ پھر اُن کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے جنگ[2] کا اعلان ہے۔

۳۔ آئندہ، کوئی مشرک اللہ کے گھر میں داخل نہ ہو سکے گا۔

۴۔ کوئی شخص ننگے بدن طواف نہیں کرے گا۔

---

[1] مکہ معظمہ گزشتہ سال ۲۰ رمضان کو فتح ہو چکا ہے جس کو آج ۱۰ ذی الحجہ ۹ھ کو پندرہ مہینے گزر چکے ہیں۔ اب تک مشرکوں اور کافروں سے کچھ نہیں کہا گیا اور آج بھی چار ماہ کی مزید مہلت دی جا رہی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور سیر چشمی کیا ہو سکتی ہے؟ پھر بھی کہا جاتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔

[2] اس اعلان کے بموجب کسی قبیلے سے بھی جنگ کی نوبت نہیں آئی کیونکہ اس سے پہلے ہی وہ سب لوگ مسلمان ہو چکے تھے جن پر اس دفعہ کا اطلاق ہو سکتا تھا۔

حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الواحد

مُدرّس و نائب مُفتی و فاضل جامعہ مدنیہ

سوال اگر ایک شخص کے پاس صرف ایک یا دو تولے سونا یا تین سائمہ اُونٹ ہوں جن کی قیمت لگائی جائے تو چاندی کا حساب پُورا ہو جاتا ہے۔ یعنی ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت بن جاتی ہے۔ مزید اس کے پاس کچھ نہ ہو تو کیا اس شخص پر قربانی واجب ہو گی یا نہیں؟

جواب مذکورہ شخص پر قربانی واجب ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل یہ ہے۔

قربانی اور صدقہ فطر کے وجوب اور زکوٰۃ لینے کی حرمت کے واسطے دو طرح کے نصاب ہیں:

① نصاب زکوٰۃ کا موجود ہونا

اس کی دلیل میں مندرجہ ذیل عبارتیں ہیں

(الف) النصاب النامی السالم عن الدین الفاضل عن الحوائج الاصلیۃ الموجب لکل واجب مالی ـــــ والنصاب الذی لیس بنام الفارغ عما ذکر الموجب لثلاثۃ صدقۃ الفطر والاضحیۃ و نفقۃ القریب کل منھما محرم لاخذ الزکوٰۃ۔

(بحر الرائق ص ۲۴۴ ج ۲)

ترجمہ: نصاب نامی جو قرض سے سالم ہو اور حوائج اصلیہ سے فارغ ہو۔ یہ ہر واجب مالی کا موجب ہوتا ہے اور وہ نصاب جو نامی نہ ہو اور مذکور (یعنی

قرض اور حوائج اصلیہ) سے فارغ ہو۔ یہ نصاب تین چیزوں کو واجب کرتا ہے یعنی صدقہ فطر کو اور قربانی کو اور قریبی رشتہ دار کے نفقہ کو۔ ان دو نصابوں میں سے ہر ایک زکوٰۃ لینے کو حرام کرتا ہے۔

(ب) لا یصح لغنی یملك نصابا اوما یساوی قیمته من ای مال کان (مراقی الفلاح)

زکوٰۃ لینا غنی کے لیے صحیح نہیں ہے جو نصاب کا مالک ہو یا اس کی قیمت کا مالک ہو خواہ کسی بھی مال سے ہو۔

(ج) ولا الی غنی یملك قدر النصاب فارغ عن حاجة الاصلیة من ای مال کان

اعلم ان النصب ثلاثة۔ نصابٌ نام سالم من الدین فاضل عن الحوائج الاصلیة و هو موجب لکل مالی کالزکوٰة والکفارات بانواعها۔ ونصابٌ لیس بنام فارغ عما ذکر و یتعلق به وجوب الاضحیة وصدقة الفطر و نفقة الاقارب وحرمان اخذ الزکوٰة۔ ونصابٌ یتعلق به حرمة السوال وهو من یملك قوت یومه والمراد الاولان واطلاق النصاب علی الثالث مجاز شرعی

(طحطاوی علی الدر المختار ج ۱ ص ۴۲۴)

ترجمہ: زکوٰۃ لینا صحیح نہیں ہے ایسے غنی کو جو حاجت اصلیہ سے فارغ نصاب کے بقدر کسی بھی مال کا مالک ہو، جان لو کہ نصاب تین طرح کے ہیں ایک نصاب وہ ہے جو مال نامی کا ہو، قرض سے سالم ہو اور حوائج اصلیہ سے فارغ ہو۔ یہ ہر مالی حق جیسے زکوٰۃ اور تمام اقسام کے کفارات کا موجب ہوتا ہے۔ دوسرا نصاب مال غیر نامی کا ہے اور یہ بھی مذکور (یعنی قرض و حاجت اصلیہ) سے فارغ ہو۔ اس نصاب کے ساتھ قربانی اور صدقہ فطر اور قریبی رشتہ داروں کے نفقہ کا وجوب اور زکوٰۃ لینے کی حرمت وابستہ ہے۔ تیسرا نصاب وہ ہے جس کے ساتھ سوال کی حرمت وابستہ ہے اور یہ اس شخص کو حاصل ہے جو ایک دن کی خوراک اپنے پاس رکھتا ہو۔

متن میں جو غنا مذکور ہے اس سے مراد پہلے دو نصاب ہیں جبکہ تیسرے پر نصاب کے لفظ کا اطلاق مجاز شرعی ہے۔

② دو سو دراہم کی قیمت کا مال ہونا خواہ وہ مال کوئی سا بھی ہو

اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں جن سے قیمت کے اعتبار کو ترجیح معلوم ہوتی ہے۔

(الف) لا یصح دفعها لغنی یملك نصابا او ما یساوی قیمته من ای مال کان فاضل عن حوائجه الاصلیة (مراقی الفلاح)

ترجمہ: زکوٰۃ ایسے غنی کو دینا صحیح نہیں ہے جو نصاب کا مالک ہو یا نصاب کی قیمت کا مالک ہو خواہ کسی بھی مال سے جبکہ وہ اس کے حوائج اصلیہ سے فارغ ہو۔

(ب) (قوله من ای مال کان) یعنی سواء کان دراهم او دنانیر او سوائم او عروضا للتجارة او لغیر التجارة لکنه فاضل عن حاجته الاصلیة اه زاهدی (حاشیہ شلبی علی تبیین الحقائق ج ۱ ص ۳۳۶)

ترجمہ: یہ کہنا کہ خواہ کسی بھی مال سے ہو تو اس سے مراد ہے کہ خواہ دراہم ہوں یا دنانیر ہوں یا چوپائے ہوں یا سامان ہو خواہ تجارتی یا غیر تجارتی، البتہ حاجت اصلیہ سے فارغ ہو۔

(ج) واستدل له فی الکافی بقوله صلی الله علیه وسلم من سأل وله مایغنیه فقد سأل الناس الحافا قیل وما الذی یغنیه قال مائتا درهم أو عدلها اه فقد شمل الحدیث اعتبار السائمة بالقیمة لاطلاقه - وقد نص علی اعتبار قیمة السوائم فی عدة کتب من غیر خلاف فی الاشباه والسراج والوهبانیة وشرحیها والذخائر الاشرفیة - و فی الجوهرة قال المرغینانی اذا کان له خمس من الابل قیمتها اقل من مائتی درهم تعمل له الزکوٰة و تجب علیه - و بهذا ظهران المعتبر نصاب

النقد من ای مال کان بلغ نصابا من جنسه اولم یبلغ (رد المحتار ص۲)

ترجمہ: کافی میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد کہ جس نے غنا کے ہوتے ہُوئے سوال کیا تو اس نے لپٹ کر سوال کیا۔ پوچھا گیا کہ غنا کیا ہے۔ فرمایا دو سو درہم یا اس کے مساوی اھ یہ حدیث اپنے اطلاق کی بنا۔ پر چوپایوں کی قیمت کو بھی شامل ہے اور بہت سی کُتب۔ مثلاً اشباہ اور سراج اور وہبانیہ اور اس کی دو شرحوں اور ذخائر اشرفیہ میں بلا اختلاف چوپایوں کی قیمت کا اعتبار کرنے کی تصریح ہے اور جوہرہ میں ہے کہ مرغینانی نے کہا جب آدمی کے پاس پانچ اُونٹ ہوں جن کی قیمت دو سو درہم سے کم ہو تو اس کے لیے زکوٰۃ لینا حلال ہوتا ہے اور اس پر زکوٰۃ دینا واجب بھی ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ نقدی کے نصاب کا اعتبار ہے خواہ کسی بھی مال سے ہو اور خواہ اس مال کی جنس میں نصاب پُورا ہو یا نہ ہو۔

ہماری اس تقریر پر دو اعتراض ہو سکتے ہیں۔ ہم وہ اعتراض اور ان کے جواب ذکر کرتے ہیں۔

پہلا اعتراض تم کہتے ہو کہ دو سو درہم کی قیمت کے اعتبار سے وہ کوئی سا بھی مال، ہو خواہ نامی ہو یا غیر نامی ہو، حالانکہ بدائع اور طحطاوی میں اس مال کو غیر نامی کے ساتھ مقید کیا ہے۔

بدائع میں ہے: اما الغنی الذی یحرم به اخذ الصدقة و قبولها فهو الذی تجب به صدقة الفطر و الاضحیة وهو ان یملك من الاموال التی لا تجب فیها الزکوٰة مایفضل عن حاجته و تبلغ قیمة الفاضل مائتی درهم من الثیاب والفرش والدور والحوانیت والدواب والخدم زیادة علی ما یحتاج الیه کل ذلك للابتذال والاستعمال لا للتجارة والاسامة۔ فاذا فضل من ذلك مایبلغ قیمته مائتی درهم وجب علیه صدقة الفطر والاضحیة وحرم علیه اخذ الصدقة۔

(ص۴۸ ج۲ بدائع الصنائع)

ترجمہ: وہ غنا جس کے ہوتے ہوئے زکوٰۃ لینا اور قبول کرنا حرام ہوتا ہے وہ ہے جس سے صدقہ فطر اور قربانی واجب ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی ان احوال میں سے کہ جن میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی اتنے کا مالک ہو کہ جو اس کی حاجت سے زائد ہو اور یہ زائد دو سو درہم کی قیمت کے برابر ہوں۔ یہ اموال خواہ کپڑے ہوں یا بستر ہوں یا مکان ہو یا دکانیں ہوں یا جانور ہوں یا غلام ہوں البتہ حاجت سے زائد ہوں اور یہ سب استعمال کے لیے ہوں تجارت اور نسل کشی کے لیے نہ ہوں جب یہ اتنے زائد ہو جائیں کہ اُن کی قیمت دو سو درہم کے برابر ہو تو آدمی صدقہ فطر اور قربانی واجب ہوتی ہے اور اس پر زکوٰۃ لینا حرام ہو جاتا ہے۔

اور طحطاوی میں ہے۔

و نصاب لیس بنام فارغ عما ذکر ـــــ الخ (طحطاوی علی الدر ص ۲۷ ج ۱)

ترجمہ: وہ نصاب جو نامی نہ ہو اور مذکورہ قرض اور حاجت اصلیہ سے فارغ ہو

جواب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ترجیح اس بات کو حاصل ہے کہ نصابِ زکوٰۃ پورا نہ ہونے میں اصل اعتبار مال کی قیمت کا ہے۔ جنس کے عدد و وزن کا نہیں ہے۔ اس حقیقت کو جان لینے کے بعد اب دونوں قسم کی عبارتوں کے درمیان اس طرح تطبیق دیجیے کہ جن حضرات نے مال کو مطلق ذکر کیا ہے۔ مثلاً صاحبِ مراقی الفلاح اور شلبی اور صاحب شرنبلالیہ وغیرہ نے تو اُنھوں نے اس بات کو پیشِ نظر رکھا کہ قیمتوں میں تفاوت کے باعث ہو سکتا ہے کہ تین اُونٹوں کی قیمت دو سو درہم کے برابر ہو، اور جن لوگوں نے مال کو غیر نامی کے ساتھ مقید ذکر کیا اُنھوں نے اس بات کو پیشِ نظر رکھا کہ عہد نبوی میں پانچ اُونٹ یا بیس دینار وغیرہ دو سو درہم مالیت کے ہوتے تھے۔ لہٰذا دو سو درہم کی قیمت کا مال نامی تو خود نصاب زکوٰۃ بنتا ہے۔ لہٰذا اُنھوں نے غیر نامی کے ذکر پر اکتفا کیا۔

دوسرا اعتراض علامہ مرغینانی رحمہ اللہ سے جوہرہ نے یہ نقل کیا ہے۔

اذا کان له خمس من الابل قیمتها اقل من مائتی درهم تحل له الزکوٰة و تجب علیه

(جب آدمی کے پاس پانچ اُونٹ ہوں اور ان کی قیمت دو سو درہم سے کم

ہو تو اس کے لیے زکوٰۃ لینا حلال ہوتا ہے اور اس پر زکوٰۃ دینا واجب بھی ہوتا ہے)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ چاندی کے علاوہ کوئی اور نصاب جب دو سو درہم کی مالیت سے کم ہو تو اس سے زکوٰۃ کا لینا حرام نہیں ہوتا جبکہ تم کہتے ہو کہ مطلق نصاب زکوٰۃ کا ہونا زکوٰۃ لینے کو حرام کرتا ہے۔

جواب میں مندرجہ ذیل وجوہ ہیں

(الف) یہ علامہ مرغینانی رحمہ اللہ کا محض قیاس ہے اور اس کے معارض بحرالرائق کا یہ قول ہے

دخل تحت النصاب النامی المذکور أولا الخمس من الابل السائمة فان ملکها او نصابا من السوائم من ای مال کان لا یجوز دفع الزکوٰة الیه سواء کان یساوی مائتی درهم أولا (بحر ص ۲۴۳ ج ۲)

وتبعه علی هذه اخوه وتلمیذه فی المنح (منحة الخالق)

ترجمہ: نصاب نامی جو پہلے مذکور ہوا۔ اس کے تحت پانچ سائمہ اونٹ بھی ہیں تو اگر کوئی ان کا مالک ہو یا اور چوپایوں میں سے نصاب کا مال ہو تو اس شخص کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں خواہ اس نصاب کی قیمت دو سو درہم کے برابر ہو یا نہ ہو۔

اور صاحب بحر کی موافقت اُن کے بھائی نے نہر فائق میں اور ان کے شاگرد نے منح الغفار میں کی ہے

(ب) نصاب زکوٰۃ مطلقاً خود زکوٰۃ لینے کو حرام کرتا ہے جیسا کہ صاحب بحر اور طحطاوی کے حوالجات سے واضح ہے۔

(ج) معطی زکوٰۃ اعلیٰ درجہ کا غنی ہے، جبکہ زکوٰۃ لینے والا فقیر ہوتا ہے۔ ایک ہی نصاب غنا اور فقر دونوں کا موجب ہو، یہ ممکن نہیں کیونکہ اس سے اجتماعِ ضدین لازم آتا ہے۔ یہاں اعتباری فرق کا لحاظ رکھنا ممکن نہیں کیونکہ اس صورت میں یہ خود معطی بھی بنے گا اور آخذ بھی بنے گا اور وہ اپنی زکوٰۃ اپنے آپ کو دے سکے گا۔ حالانکہ یہ بات شرع میں معہود و معروف نہیں ہے۔

مولانا نعیم الدّین صاحب ، فاضل و مدرس جامعہ مدنیہ

دورِ صحابہؓ کے ایک غلام کی سخاوت

"حضرت عبداللہ بن جعفرؓ ایک مرتبہ جنگل میں تشریف لے جا رہے تھے راستے میں ایک باغ پر گزر ہُوا، وہاں ایک حبشی غلام باغ میں کام کر رہا تھا، اس کی روٹی آئی اور اس کے ساتھ ہی ایک کُتّا بھی باغ میں چلا آیا اور اس غلام کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ اس غلام نے کام کرتے کرتے ایک روٹی اس کُتّے کے سامنے ڈال دی۔ اس کُتّے نے اس کو کھا لیا اور پھر کھڑا رہا۔ اس نے دوسری اور پھر تیسری روٹی بھی ڈال دی۔ کل تین ہی روٹیاں تھیں وہ تینوں کُتّے کو کھلا دیں۔ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ غور سے کھڑے دیکھتے رہے جب وہ تینوں ختم ہوگئیں تو حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے اس غلام سے پُوچھا کہ تمہاری کتنی روٹیاں روزانہ آتی ہیں؟ اس نے عرض کیا آپ نے ملاحظہ تو فرما لیا تین ہی آیا کرتی ہیں۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ پھر تینوں کا ایثار کیوں کر دیا؟ غلام نے کہا حضرت یہاں کُتّے رہتے نہیں ہیں۔ یہ غریب بھوکا کہیں دُور سے مسافت طے کر کے آیا ہے اس لیے مجھے اچھا نہ لگا کہ اس کو ویسے ہی واپس کر دوں۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ پھر تم آج کیا کھاؤ گے؟ غلام نے کہا ایک دن فاقہ کر لوں گا یہ تو کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے۔ حضرت عبداللہؓ

بن جعفر نے اپنے دل میں سوچا کہ لوگ مجھے ملامت کرتے ہیں کہ تو بہت سخاوت کرتا ہے یہ غلام تو مجھ سے بہت زیادہ سخی ہے یہ سوچ کر شہر میں واپس تشریف لے گئے اور اس باغ کو اور غلام کو اور جو کچھ سامان باغ میں تھا سب کو اُس کے مالک سے خریدا اور خرید کر غلام کو آزاد کیا اور وہ باغ اس غلام کی نذر کر دیا۔" [1]

حضرت امام شافعیؒ کی حضرت حماد بن ابی سلیمانؒ سے محبّت

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ (م ۲۰۴ھ) فرماتے ہیں کہ مجھے حماد بن ابی سلیمانؒ سے ہمیشہ محبّت رہی اس وجہ سے کہ مجھے اُن کا ایک واقعہ معلوم ہوا تھا، اور وہ یہ تھا کہ وہ ایک دن گدھے پر سوار جا رہے تھے اس کے ایڑ ماری وہ جو زور سے دوڑا تو اس کے جھٹکے سے حضرت حمادؒ کے کرتے کی گھنڈی ٹوٹ گئی، راستے میں ایک درزی کی دکان نظر پڑی اس کو سلوانے کے لیے اُترنے لگے، درزی نے کہا: اترنے کی ضرورت نہیں معمولی کام ہے میں ابھی لگائے دیتا ہوں، درزی نے کھڑے ہو کر وہ گھنڈی کرتے میں سی دی، حمادؒ نے اس کی اُجرت میں ایک تھیلی دی جس میں دس اشرفیاں تھیں اور معاوضے کی کمی کی معذرت کی۔" [2]

شیخ محی الدین ابن عربیؒ کی دریا دلی

"حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (م ۶۳۸ھ) صوفیاء کرام میں جس مقام بلند کے حامل ہیں وہ کسی پڑھے لکھے شخص سے مخفی نہیں، آپ

---

[1] احیاء العلوم عربی ج ۳ ص ۲۵۸

[2] مناقب ابی حنیفۃ للامام موفق بن احمد مکی ص ۴۹، احیاء العلوم ج ۳ ص ۲۵۱

۵۶۰ھ میں اندلس کے شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے تھے، پھر وہاں سے اشبیلیہ منتقل ہوئے وہاں آپ کسی بادشاہ کے منشی کا کام کرتے تھے، لیکن پھر زہد کا غلبہ ہوا اور تمام دنیوی مشاغل چھوڑ کر یادِ خدا میں مصروف ہوگئے، بادشاہ نے ان کو ایک گھر تحفے میں دیا تھا جس کی قیمت اس وقت ایک لاکھ درہم تھی، کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ کوئی سائل آگیا اُسے دینے کے لیے ان کے پاس کچھ نہیں تھا، چنانچہ وہ گھر اُسے صدقہ کردیا۔[1]

باہمی احترام

"حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ (المتوفی ۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء) حضرت خواجہ علاء الدین علی احمد صابرؒ (کلیری م ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء) کی بڑی تعظیم کرتے اور جب کسی کو ان کے پاس کلیر شریف بھیجتے تو تاکید کرتے کہ وہ ان کی تعظیم و تکریم میں کوئی فرق نہ آنے دے تاکہ ان کو ملالِ خاطر نہ ہو۔

حضرت علاء الدین علی احمد صابرؒ زیادہ لوگوں کو مرید نہیں کرتے تھے۔ ایک بار حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیاء کے ایک مرید نے حضرت علاء الدین علی احمد صابرؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ نے حضرت شیخ شمس الدین ترکؒ پانی پتیؒ (المتوفی ۷۱۹ھ/۱۳۱۹ء) کے سوا کسی کو خلیفہ نہیں بنایا، لیکن میرے شیخ خواجہ نظام الدینؒ اولیاء کے مریدوں کی تعداد آسمان کے ستاروں سے زیادہ ہے یہ سُن کر خواجہ علاء الدین علی احمد صابرؒ نے فرمایا کہ میرے شمس سب پر اسی طرح غالب ہیں جس طرح کہ آفتاب ستاروں پر غالب رہتا ہے، حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیاء کے مرید نے جب اپنے شیخ سے یہ بات دہرائی تو اُنھوں نے فرمایا کہ تم نے ان کو

---

[1] جہانِ دیدہ ص ۲۸۶

کیوں رنج پہنچایا، آئندہ ایسی بات ان سے نہ کہنا، وہ مقربِ بارگاہِ ربّانی ہیں، جو کچھ فرمایا صحیح ہے۔ (سیر الاقطاب ص ۱۸۴-۱۷۷)[1]

ایسا ہی ایک واقعہ تاریخ نے حضرت خواجہ نظام الدّین اولیاءؒ اور شیخ رکن الدین ملتانی رحمہ اللہ (م ۷۳۵ھ) کا محفوظ رکھا ہے۔ سیّد صباح الدین مرحوم کی زبانی وہ بھی ملاحظہ فرماتے چلیں۔ موصوف رقمطراز ہیں۔

"ایک مرتبہ ایک خراسانی عالم نے حضرت شیخ نظام الدّین اولیاءؒ سے کہا کہ میں آپ کے پاس آتا ہوں تو ہر بار مجھ کو کچھ نہ کچھ کھلاتے ہیں، لیکن میں شیخ رکن الدینؒ کے پاس کئی بار گیا، اُنھوں نے مجھ کو کوئی چیز نہیں کھلائی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے جواب دیا کہ میں اس حدیث پر عمل کرتا ہوں مَنْ زَارَ حَیًّا وَلَمْ یَذُقْ مِنْهُ شَیْئًا فَکَاَنَّمَا زَارَ مَیِّتًا، یعنی جو شخص زندہ کی زیارت کرے اور اُس کے یہاں کچھ نہ چکھے تو گویا اس نے مُردے کی زیارت کی، خراسانی عالم نے پُوچھا کیا شیخ رکن الدّینؒ تک یہ حدیث نہیں پہنچی ہے، حضرت محبوبِ الٰہی نے فرمایا، شیخ رکن الدّینؒ عملِ معنوی کرتے ہیں اور وہ ذوقِ روحانی چکھاتے ہیں، خراسانی عالم نے کسی موقع پر شیخ رکن الدّینؒ سے عرض کیا کہ شیخ نظام الدینؒ کہتے ہیں کہ شیخ رکن الدینؒ ذوقِ روحانی دیتے ہیں اور میں ذوقِ جسمانی دیتا ہوں، شیخ رکن الدینؒ نے فرمایا: برادرم نظام الدّینؒ نے تواضع کی ہے، اُن میں دونوں وصف ہیں وہ ذوقِ روحانی بھی عطا کرتے ہیں اور ذوقِ جسمانی بھی۔"[2]

---

[1] ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں ص ۶۵

[2] بزم صوفیہ ص ۳۱۱